دسمبر 2019ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح صفحہ 6

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

ICAEW
CHARTERED
ACCOUNTANTS

QUALIFIED
CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- Company Incorporation / Registered Office Address
- Personal Income Tax Return investigations
- Rental Income Tax Returns
- UK State Pension Entitlement Review
- Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
- UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- Private UK Pension Tracing
- Assets Review for Inheritance Tax
- Appealing - Past years HMRC Penalties
- Preparation / Filing of prior year tax returns
- Duplicate - Payslips / P60s

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 **FAX** +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM **WEB** WWW.SARMADGLOBAL.COM

هُوَالـــــــــــــنَاصر
خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ
بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم
گر کُفر این بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 2   شمارہ نمبر 12   ربیع الثانی 1441   دسمبر 2019ء

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی
سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی
ایڈیٹر
منزہ خان

انچارج میڈیا سیل
فضل الرحمان کھوکھر
انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی
انچارج بزم اطفال
عیشۃ الراضیہ عباسی

ہمارے نمائندگان
سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367
عرفان احمد خان (جرمنی)
+49-1711974701
ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548
محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-6433112
ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825
بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887
حاجی میاں محمد وقار یعقوب
(نمائندہ جنوبی پنجاب پاکستان)
+92-300-6912-273
روحان احمد طاہر (پاکستان)
چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

اس شمارہ میں

04 درس قرآن کریم
05 اداریہ
06 بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح
09 خراب عدالتی نظام کا پوسٹ مارٹم
11 سقوط حیدرآباد: مسلمان حاکم کی خواہش کے باوجود انڈیا کی یہ ریاست پاکستان کا حصہ کیوں نہ بن سکی؟
15 نفرت و انتقام کی سیاست جذبۂ انسانیت پر غالب آچکی
16 میں تو اچھا ہوں تم برے ہو
17 جھوٹے مقدمات کو روکنے میں پاکستان کا قانون کتنا موثر؟
19 ایک تھا بڑا آدمی!
20 لاہور کا پانی 6 سال بعد ختم؟
21 تختِ لاہور کا ”لاہوری انصاف“
23 وراثت بسلسلہ میں تے منو بھائی
24 صدقے جاواں مولانا
26 دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
28 جنسی تعلیم: قصور جیسے واقعات روکنے کے لیے ارم فاطمہ نے بچوں کی آگاہی کا بیڑا خود اٹھالیا
30 بلوچستان یونیورسٹی: ’ہراس کیے جانے کے الزامات درست ہوئے تو ہم انسان کہلانے کے قابل نہیں‘
32 بابا گرونانک یونیورسٹی ’دوسری یونیورسٹیوں سے تھوڑی مختلف‘ کیسے ہوگی؟
33 انسان کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت
34 جنگ آزادی مئی 1857ء اور میو قوم
36 عرب بہار جو خزاں سے اجڑ گئی
37 ضرورت ہے اٹھارہ فلسفیوں کی
39 یہ انصاف ہے۔ کار لا فے ٹکر
40 گنیز ورلڈ ریکارڈ حاصل کرنے والے منی ایچر آرٹسٹ احسن قیوم پنسل کے سکے پر ایک پوری دنیا سمو دیتے ہیں
42 ”ایتھوپیا“ بھی ہم سے آگے نکل گیا!
43 بائیومیٹرک کیا ہے اور کیا نہیں ہے
45 چند انوکھے ملک
48 جیجیلیا جُجورانا: پاکستان میں بجلی کی تاروں سے ’پرندوں کے بادشاہ‘ کو خطرہ
50 بھوپت ڈاکو: انڈیا کا وہ ڈاکو جسے پاکستان نے پناہ دی
52 اُلوؤں کی چوری کیوں بڑھتی جارہی ہے؟
54 برطانیہ میں نکاحِ متعہ کا بڑھتا ہوا رواج
56 سری کرشن جی کے سوانح پر تقریر
58 اہلِ فارس کی فکری و عملی میراث اور علامہ اقبال
60 مشاعرے، تالیاں، سیٹیاں اور آپ کا شعری ذوق
62 اردو زبان ...... تاابد پائندہ باد
64 شعر و شاعری
65 ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں سے حسن سلوک

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

website : lahoreinternational.com
اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:
lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیے۔

درس قرآن کریم

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫﴿۳﴾ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّ
زَّنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّہُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۙ﴿۶﴾ یَّوۡمَ
یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۷﴾ (سورۃ المطففین: 1تا7)

ترجمہ: ہلاکت ہے تول میں ناانصافی کرنے والوں کے لئے۔ یعنی وہ لوگ کہ جب وہ لوگوں سے تول لیتے ہیں بھرپور (پیمانوں کے ساتھ) لیتے ہیں۔ اور جب ان کو ماپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ یقین نہیں کرتے کہ وہ ضرور اٹھائے جائیں گے۔ ایک بہت بڑے دن (پیش ہونے) کے لئے۔ جس دن لوگ تمام جہانوں کے ربّ کے حضور کھڑے ہوں گے۔

تفسیر:

اس سورت میں ایک دفعہ پھر میزان کی طرف انسان کو متوجہ فرمایا گیا ہے کہ تم تبھی کامیاب ہو سکتے ہو اگر عدل پر قائم ہو۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے پیمانے اَور ہوں اور دینے کے پیمانے اَور۔ اس میں اِس دور کی تجارت کا بھی تجزیہ فرمادیا گیا ہے۔ بڑی بڑی امیر قومیں جب بھی غریب قوموں سے سودا کرتی ہیں تو لازماً اس سودے میں ہمیشہ غریب قوموں کا نقصان ہوتا ہے۔ فرمایا کیا یہ لوگ سوچتے نہیں کہ ایک بہت بڑے حساب کتاب کے دن وہ اکٹھے کئے جائیں گے جس میں ان کے دنیا کے سودوں کا بھی حساب ہوگا۔ یہ وہ یَوۡمُ الدِّیۡن ہے جس کا ذکر پچھلی سورت کے آخر پر گزرا ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں واضح طور پر یَوۡمُ الدِّیۡن کا ذکر فرما کر متنبہ کیا گیا کہ یَوۡمُ الدِّیۡن کے منکرین پہلے زمانوں میں بھی ہلاک کر دیئے گئے تھے اور زمانہ آخرین میں بھی بد انجام کو پہنچیں گے۔

اس کے بعد کی آیات میں اہل جہنم اور اہل جنت کا تقابلی جائزہ پیش فرمایا گیا ہے اور متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اس دن وہ لوگ جن سے یہ دنیا میں تمسخر کرتے ہوئے آوازے کستے اور آنکھوں کے اشاروں سے ان کی تذلیل کرتے ہوئے انہیں کافر گردانا کرتے تھے، وہ ان کفار پر ہنسیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ بتاؤ اب تمہارا کیا حال ہے؟ (ترجمہ / تفسیر حضرت مرزا طاہر احمدؒ)

حدیث

حدیث شریف میں ہے کہ جب لوگ ناپ تول میں خیانت کرتے ہیں تو خداوند کریم بارشوں کو روک لیتا ہے۔ قحط شدید پڑتا ہے۔ حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت میں یہ مرض خصوصیت سے ہوگا۔ مگر اس وقت تو بات حد سے بڑھ گئی ہے۔ بلکہ مزید خصوصیت ایک اور یہ ہوگئی کہ مباحثات میں وہ اعتراض کئے جاتے ہیں جو خود معترضین پر بھی وارد ہوتے ہیں جس پیمانہ سے خصم کو جواب دیتے ہیں۔ اسی پیمانہ سے جواب لینا پسند نہیں کرتے۔ حدیث شریف میں ہے:

لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیۡہِ مَا یُحِبُّ لِنَفۡسِہٖ

مباحثات کے وقت دیکھ لیا کریں کہ کیا یہی اعتراض پلٹ کر ہم پر تو نہیں پڑتا۔

(حوالہ حقائق الفرقان جلد چہارم صفحہ 342)

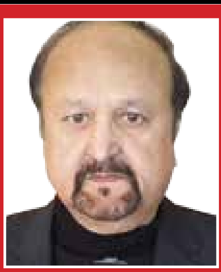

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

اداریہ

"دھرنا۔ دھرنا۔ دھرنا تو مرغی کا ہوتا ہے"

مشہور کہاوت ہے مرغی حرامانہ ہو تو دوسرے گھر انڈا کیوں دے۔ "دھرنا" ہمیشہ مرغی کے دھرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مرغی اب اور انڈے نہیں دے گی بلکہ انڈوں کو سینے کے لئے قدرتی نظام کے مطابق انڈوں پر بیٹھ کر ان میں سے بچوں کے نکلنے کا فریضہ انجام دے گی۔

ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی سیاستدانوں نے جس طرح "لوٹے" لفظ پر قبضہ کیا تھا اور اس لفظ کو معروف برتن کے ساتھ ساتھ ہر شخص پر بولنے لگے جو اپنی سیاسی جماعت یا نظریئے کو چھوڑ کر دوسری جماعت یا نظریئے کو اپنائے اور اس کا اپنا کوئی مستقل موقف یعنی پیندا نہ ہو۔ اب جس لفظ پر قبضہ جمایا جا رہا ہے وہ ہے "دھرنا" معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس لفظ میں جو یہ مفہوم تھا کہ مرغی انڈے دینے کے کام سے یا اپنے مفید کام سے دستبردار ہو چکی ہے۔ اسے نظرانداز کر دیا گیا ہے ورنہ کون سا ایسا سیاستدان ہے جو یہ تسلیم کرنے کو تیار ہو گا کہ اس کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور اس کا کام کرنے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

"دھرنا" اب ان معنوں میں استعمال ہو رہا ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک جگہ بیٹھے یا لیٹے رہیں گے جب تک مذکورہ مقاصد حاصل نہیں ہو جاتے۔ یہ لفظ اور یہ طریق بہت مقبول اور عام ہو رہا ہے۔ کھلاڑی لڑکے اور بچے، معمر و معزز بزرگ، فیشن ایبل خواتین اور کالجوں سکولوں کی لڑکیاں لڑکے سب ہی اس میں شامل ہونے لگے البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ ایسے دھرنوں سے کتنے چوزے نکلے یا کتنے بچے حاصل ہوئے۔ پاکستان میں دو دھرنے مشہور ہوئے۔ ایک مشہور عالم مذہبی رہنما عوامی لیگ کے طاہر القادری دوسرا کرکٹ کے کھلاڑی غیر مذہبی لیڈر عمران خان۔ طاہر القادری نے بڑی بڑی تقاریر کیں۔ آج یہ نظام ختم۔ یہ حکومت ختم۔ اب نیا نظام آیا ہی چاہتا ہے۔ ہم یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے۔ ہر چینل پر لمبے لمبے پروگرام چلے۔ لوگ خوشی کے مارے اچھے نتائج کا انتظار کرنے لگے خاص طور پر اس لئے بھی کہ اس دھرنے میں قبریں کھودے اور کفن وغیرہ بھی دکھائے گئے اور مرنے مارنے کی حد تک جا کر اپنے مقاصد حاصل کیا جائے گا مگر ہوا کیا پتہ چلا موصوف کینیڈا واپس چلے گئے اور پاکستان میں ویسا ہی رہا جیسا کہ پہلے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دھرنا ناقص تھا یا انڈے ناقص تھے۔ مولانا موصوف اب تو سیاست ہی چھوڑ چکے ہیں۔ دوسرا دھرنا مشہور کھلاڑی آج کے وزیر اعظم عمران خان صاحب کا تھا جو عالمی سطح کا طویل ترین دھرنا 126 دن کا۔ ان کی سیاست کا 24 سال کا یہ سفر آخر وزیر اعظم بنا گیا لیکن یہ بھی دھرنے کے مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکے ان کے دھرنے میں یہ نعرہ بھی تھا کہ وزیر اعظم نواز شریف کے استعفیٰ کے بغیر واپس نہیں جائیں گے لیکن نتیجہ حاصل کئے بغیر ہی گھر واپس چلے گئے اور دھرنا ختم کر دیا۔ دھرنے کے بعد اگر چوزے اور بچے نہیں نکلے تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مرغی دھرنے کے دوران راتوں کو دھرنا چھوڑ کر کہیں اور نکل جاتی تھی اور اس طرح دھرنے کا قدرتی طریق درہم برہم ہو جاتا تھا اور ایسی صورت میں تو انڈے گندے اور خراب ہی ہو سکتے تھے۔ اچھے نتائج کی توقع عبث اور فضول تھی۔ اب حالیہ دنوں کا تیسرا دھرنا بھی انہی دھرنوں سے مماثلت رکھتا ہے لیکن ایک بات ان دونوں مذہبی دھرنوں مولانا طاہر القادری اور مولانا فضل الرحمن کا۔ یہ خالصتاً مذہبی رہا اور کھول کر مذہبی کارڈ کا استعمال ہوا۔ ختم نبوت اور توہین رسالت کے نام کو استعمال کیا گیا جو خدا تعالیٰ کو پسند نہیں آیا اسی لئے یہ ناکام رہے دوسرا غیر مذہبی تھا جو کچھ پروان چڑھا۔

مولانا کے دھرنے نے کئی سوالات کو جنم دیا۔ ایک تو ان کا دعویٰ کہ دس پندرہ لاکھ کا جلسہ ہو گا، وزیر اعظم کا استعفیٰ، اسلام آباد کو بند کر دیں گے، اس کے بعد پورے پاکستان کو بند کر دیں گے۔ ان میں سے کچھ بھی ایسا نہیں ہوا خالی ہاتھ مولانا کو گھر واپس جانا پڑا۔ پچھلے ماہ کے آرٹیکل میں راقم الحروف نے ایسا ہی تجزیہ کیا تھا۔ مولانا کے دھرنے کو ختم کرتے وقت سیاسی کھلاڑی "ق لیگ" کے چوہدری پرویز الٰہی کے درمیان کیا معاہدہ ہوا وہ بھی کھل کر سامنے آجائے گا وقت کا انتظار کریں۔ ہونا کچھ نہیں ملنا کسی کو کچھ نہیں البتہ جو کوشش اور خواب چوہدری پرویز الٰہی دیکھ رہے ہیں یعنی وزیر اعلیٰ پنجاب کی کرسی کے وہ انہونی نہیں چونکہ سیاست میں ایسے بے رحم فیصلے ہوتے رہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو لولی پاپ مولانا فضل الرحمن کو چوہدری صاحب نے دی اس کا آپریشن کب ہوتا ہے؟ یاد رہے جب چوہدری صاحب وزیر اعلیٰ پنجاب تھے اس وقت مولانا فضل الرحمن کے دل کا آپریشن کرا چکے ہیں اور وہ بھی امریکہ کے مشہور احمدی ڈاکٹر مبشر صاحب سے جو اب تک مولانا کا دل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ کیا اب دوبارہ ایسا ہونے والا ہے؟ یہ بھی حقیقت ہے کہ موصوف بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے ہم نکلے مولانا نے اس دھرنے میں مالی فوائد ضرور حاصل کئے اس میں کوئی دو رائے نہیں ایجنسیوں کو اس کی رپورٹ ہے۔

بقول مشہور صحافی اینکر پرسن سمیع ابراہیم کے کہ مولانا کے دھرنے میں غیر رجسٹرڈ شدہ، اسمگل شدہ افغانستان کے ذریعہ 400 اعلیٰ قسم کی گاڑیاں ان کے قافلے میں شریک ہو کر اسلام آباد کے شو رومز میں پہنچ گئیں۔ فی کار سات آٹھ لاکھ روپے مولانا کو ملے۔ اس کے علاوہ دو بڑی سیاسی پارٹیوں نے بھی کروڑوں روپے دیئے۔ مولانا کرپشن کے کھلاڑی ضرور ہیں مالی فائدہ لئے بغیر گھر نہیں گئے۔ مذکورہ بالا دونوں دھرنوں کا زمانہ چند سالوں کے لئے مؤخر ہو گیا۔ ایک بات جو دیکھی گئی ان دھرنوں میں کہ اخلاق و قانون کا جنازہ نکال دیا گیا۔ لاقانونیت کی ترغیب دی گئی، بداخلاقی کے عملی مظاہرے دیکھے گئے۔ اے کاش ہمارے نام نہاد لیڈر اور رہنما دہشت گردی، انتہا پسندی، عدم برداشت، غربت، جہالت اور مہنگائی کو ختم کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کرتے۔

شعبہ پاکستان

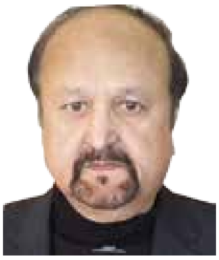

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح

تحریر: محی الدین عباسی

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیراں
اے قائد اعظم تیرا احسان ہے احسان

25/ دسمبر قائد اعظم محمد علی جناح کا143واں یوم پیدائش ہے۔ آپ کی پیدائش کا دن قومی سطح پر منایا جاتا ہے اور اس دن عام تعطیل ہوتی ہے۔ زندہ قومیں ہمیشہ اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلتی ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ ہمیں ان کی قدر اور نعمت خداوندی سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔ قائد اعظم 25/ دسمبر 1876 کو وزیر مینشن کراچی میں پیدا ہوئے اور 1948ء کو کراچی میں ہی وفات پائی۔ ابتدائی تعلیم 1882ء تک کراچی میں اور 1886ء سے 1891ء تک بمبئی میں حاصل کی۔ پھر 1891ء کو واپس آگئے اور 1892ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ 1893ء اور 1894ء کے درمیانی عرصے میں جرنلزم میں لگاؤ پیدا ہوا۔ اسی عرصے میں لارڈ مارلے سے بھی کچھ اثر قبول کیا اور ساتھ ہی دادا بھائی نوروجی سے بھی متاثر ہوئے۔ 1896ء میں کراچی واپس آئے۔ 1897ء میں بمبئی پہنچے۔ 1900ء تک وہاں وکالت کرتے رہے۔ 1900ء میں عارضی طور پر ریسیڈنسی مجسٹریٹ بنے۔ 1908ء میں سیاست میں قدم رکھا جو اس سال کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا تھا۔ اسی سال وہ دادا بھائی نوروجی کے سیکرٹری بنے اور کانگریس میں شامل ہوئے۔ 1910ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے لئے چنے گئے۔ 1912ء میں انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی اگرچہ وہ مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ 1913ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے لئے وہ پھر منتخب ہوئے۔ وہاں انہوں نے کریمینل لاء ترمیمی بل پر تقریر کی۔ مسلمان وقف و بلڈنگ بل پیش کیا اس پر تقریر کی۔ اور وائسرائے نے اسے منظور کرلیا۔ اسی سال ان کے گوکھلے سے روابط بڑھے۔ دونوں مل کر انگلستان گئے۔ وہاں قائد اعظم نے لندن انڈین ایسوسی ایشن کے اجتماع میں تقریر کی۔ اسی سال انہوں نے کراچی میں کانگریس کے جلسہ میں تقریر کی اور مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ 1918ء میں رتن بائی سے شادی ہوئی۔ ذمہ دار حکومت کے مطالبہ والے منشور پر دستخط کئے۔ پھر لارڈ ولنگٹن کے خلاف ایک مظاہرہ ہوا جس کی قیادت کی۔ اس کارنامہ پر بمبئی کا جناح ہال بنا۔ 1919ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل سے استعفیٰ دیا اور اسی دوران گھر میں بیٹی پیدا ہوئی۔

آپ ایک سچے دیانتدار، محنتی، قانون پسند اور مخلص انسان تھے۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے لیڈر اور پاکستانی سیاستدان تھے۔ آپ کی قیادت نے ایک آئینی طریق پر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ریاست پاکستان کے نام سے حاصل کی جو کہ ایک لمبی جدوجہد کے بعد حکومت برطانیہ سے حاصل ہوئی۔ ہندوستان کی بیشتر مسلم تنظیمیں اور گروپ ازقسم علمائے دیوبند، جمعیت علماء ہند، جماعت اسلامی، مجلس احرار، خاکسار تحریک ان کے بھرپور مخالف رہے۔ صرف جماعت احمدیہ وہ مذہبی جماعت تھی جو اس تحریک میں شامل رہی۔ 1896ء میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی جو ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ پھر 1913ء میں مسلم لیگ اختیار کی اور 1916ء میں اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت تک آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اس وقت برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے درمیان کانگریس سے اختلافات کی وجہ سے آپ نے کانگریس چھوڑ دی اور، مسلم لیگ کی قیادت میں شامل رہے۔ آپ نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے لئے مشہور چودہ نکات پیش کئے۔ پھر مسلمان لیڈروں کے آپس کے اختلافات کی وجہ سے آپ دل برداشتہ ہو کر انڈیا چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے۔ قائد اعظم نے پہلی گول میز کانفرنس کے بعد اصلاح احوال سے سخت مایوس ہو کر انڈیا چھوڑ دیا۔ پھر کئی مسلمان لیڈروں جن میں خاص طور پر ان کے پرانے ساتھی راہنما جماعت

احمدیہ نے کوششیں کی کہ وہ واپس انڈیا آئیں اور بھرپور فعال کردار ادا کریں۔ 1933ء میں ان کی واپسی اور دوبارہ مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی غرض سے جماعت احمدیہ کے سربراہ نے اپنے لندن کے مشنری امام عبدالرحیم درد صاحب کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ قائداعظم کو واپس انڈیا مسلمانوں کی قیادت کے لئے تیار کریں اور انہیں کہیں کہ ہماری جماعت آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کے لئے اور ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہے۔ جس پر امام عبدالرحیم درد صاحب قائداعظم سے مارچ 1933ء میں ان کے دفتر واقع Kings benck wall میں ملے اور تفصیلی ملاقات کی جو 4 گھنٹے تک جاری رہی۔ آپ نے جناح سے کہا کہ مسلمانوں کی راہنمائی کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ ہی ڈوبتی کشتی کو پار لگا سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ قوم کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ چنانچہ اس تفصیلی گفتگو کے بعد قائداعظم مسجد فضل لندن تشریف لائے اور وہاں باقاعدہ ایک تقریب منعقد ہوئی۔ یہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر 16/اپریل 1933ء کو ہوئی جو ایک بڑی تقریب تھی۔ اس میں 200 سے زائد شخصیات مدعو تھیں۔ جن میں Sir Edvard Maclagen, Mr. Pathic Lawrence, Sir Danisen Raas, Prof. H.A. Arkab شامل تھے۔ جبکہ صدارت Sir Stewart Sandaman نے کی۔ قائداعظم نے اپنی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔ The eloquent persuation of the Imam left me with no escape امام (عبدالرحیم) کی فصیح و بلیغ ترغیب نے میرے لئے بچنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی۔

قائداعظم کی یہ تقریر جس کا موضوع Future of the India تھا برطانوی اور ہندوستانی پریس کی خاص توجہ کا مرکز بنی اور مشہور چوٹی کے اخبارات میں اس کی اشاعت ہوئی۔ جیسا کہ سنڈے ٹائمز لندن 9/ اپریل 1933ء۔ (مزید حوالہ جات انسائیکلو پیڈیا قائداعظم از زاہد حسین انجم ہندوستان صفحہ 780) جولائی 1933ء میں اس تقریر کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خان اور ان کی بیگم صاحبہ قائداعظم سے ملنے لندن آئے اور ان سے واپس آنے کی درخواست کی اور ان دونوں شخصیات لیاقت علی خان اور امام عبدالرحیم درد صاحب کی وجہ سے وہ واپس لوٹے اور پھر قومی سیاست میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ انہیں کوششوں کے باعث پاکستان 14/اگست 1947ء کو معرض وجود

میں آیا۔ پاکستان کی پہلی کابینہ وزیراعظم لیاقت علی خان کی سربراہی میں قائم ہوئی اور یہ مختصر وزارت تھی جن میں ابراہیم اسماعیل چندریگر ٹریڈ اینڈ سٹری۔ ملک غلام محمد خزانہ۔ سردار عبدالرب نشتر ٹرانسپورٹ اینڈ کمیونیکیشن۔ راجہ غضنفر علی خان فوڈ اینڈ ایگریکلچر۔ جگندر ناتھ منڈل لاء اینڈ لیبر۔ فضل الرحمن انٹیریئر اینڈ انفارمیشن اینڈ ایجوکیشن اور پہلی نیشنل اسمبلی کے سپیکر جگن ناتھ تھے۔ اس کے علاوہ مسیحی فرقے سے تعلق رکھنے والی شخصیات ایک سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر کارنیلیس اور فارن آفس میں ایس ایم برق کو نامزد کیا گیا۔ برق صاحب نے جب کسی وجہ سے اپنا استعفیٰ قائداعظم کو پیش کیا تو آپ نے نامنظور فرمایا اور انہیں فارن آفس میں انڈکٹ کیا۔ قائداعظم نے بلا نسل و تفریق مشہور قانون دان سیاستدان چوہدری سر محمد ظفراللہ خان کو اعلیٰ مراتب پر فائز کیا یعنی پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ بنایا اور اس تحریک میں قائداعظم نے ان سے بھرپور کام لیا۔ یہ ان کے قابل اعتماد ساتھی تھے اور انہیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھا۔ قائداعظم آزادی کے بعد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ آپ کی انتھک محنت و کاوشوں کی وجہ سے آپ کو بابائے قوم کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ 1939ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔ "میں اپنی اور اپنی پارٹی کی طرف سے آنریبل سر محمد ظفراللہ خان کو ہدیہ تبرک پیش کرنا چاہتا ہوں وہ مسلمان ہیں اور یوں کہنا چاہیے کہ گویا اپنے بیٹے کی تعریف کر رہا ہوں۔" (بحوالہ قومی جدوجہد از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صفحہ 218)۔ جولائی 1947ء میں پاکستان معرض وجود میں آنے سے پہلے پنجاب باونڈری کمیشن میں مسلم لیگ کا کیس لڑنے کے لئے قائداعظم کی نگاہ انتخاب ظفراللہ خان صاحب پر پڑی۔ اس تقرری کے بارے میں مشہور صحافی سر محمد شفیع (م۔ش) نے کہا۔ قائداعظم نے چوہدری ظفراللہ خان کو مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے کے لئے نامزد کیا تاکہ پارٹیشن کمیٹی (باونڈری کمیشن) کے سامنے پیش ہو۔ قائداعظم معمولی انسان نہیں تھے۔ وہ تاثرات کی بنا پر لوگوں کے متعلق رائے قائم کرنے کے عادی نہ تھے بلکہ تجربہ کی کسوٹی پر لوگوں کو پرکھا کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سوچ کے بعد ظفراللہ خان کو مسلم لیگ کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا تھا۔ (بحوالہ نوائے وقت لاہور میگزین 6/ مارچ 1992ء)۔ اس ضمن میں ایک صحافی منیر احمد منیر لکھتے ہیں۔ جب ظفراللہ

خان باؤنڈری کمیشن کا کیس پیش کر چکے تو قائداعظم نے انہیں شام کے کھانے کی دعوت دی اور انہیں معانقہ کا شرف بخشا جو قائد اعظم کی طرف سے کرہ ارض پر بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ اس کے بعد قائد اعظم نے کہا۔

''چوہدری ظفراللہ خان میں تم سے بہت خوش ہوں اور تمہارا ممنون بھی۔ جو کام تمہارے سپرد کیا گیا تھا تم نے اسے اعلیٰ قابلیت اور نہایت احسن طریق سے سرانجام دیا۔'' (بحوالہ کالم روزنامہ خبریں لاہور 7/ جون 2003ء)

قائد اعظم نے وزیر اعظم لیاقت علی سے مشورے کے بعد ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی جو 25/ دسمبر قائد اعظم کی پیدائش کے دن رکھی گئی۔ اس تقریب میں قائد اعظم نے چوہدری ظفراللہ خان صاحب سے پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ کا حلف لیا۔ انہوں نے 1948ء سے 1954ء تک بحیثیت وزیر خارجہ اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں پاکستانی وفد کی قیادت کے فرائض سرانجام دیئے۔ ذیل میں کچھ حوالہ جات پیش کئے جاتے ہیں جن کی رو سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گا کہ وہ کس قسم کا نظام یا نظریہ کے حامی تھے۔ 15/ دسمبر 1947ء کراچی میں آل انڈیا مسلم کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ پاکستان اسلامی نظریات کی بنا پر مبنی ایک مسلم ریاست ہو گی اور یہ کوئی پاپائیت نہیں ہو گی۔ اگر قائد اعظم کی سوچ اسلامی طرز حکومت تھی تو وہ حقیقی اسلامی تعلیمات، قرآن و سنت کی روشنی میں آنحضرت ﷺ کے آخری خطبہ حجۃ الوداع کے اصول مساوات پر مبنی اور میثاق مدینہ تھا۔ آپ نے پشاور کے اسلامیہ کالج میں 1938ء کو طلباء سے خطاب کرتے ہوئے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا جو آج کل کے مولویوں کا 72 فرقوں والا نظام ہے اور جو آج ترقی کر کے پاکستان میں طالبنائزیشن بن چکا ہے۔ قائد اعظم کا وہ عظیم خطاب جو آپ نے 11 اور 14/ اگست 1947ء کو فرمایا دیکھ لیں جس میں صاف طور پر آپ کی ذہنی وعلمی سوچ سیکولر جمہوری ہونے کا ثبوت ہے جس میں آپ نے کہا تھا کہ ہر مذہب اور فرقے کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور یہ سب کا پاکستان ہے۔ تمام لوگ آزادی سے اپنے اظہار خیال کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ آپ نے اس کے عملی ثبوت کے طور پر پاکستان کی پہلی اسمبلی کے سپیکر جگن ناتھ اور وزیر قانون جگندر ناتھ منڈل کو مقرر کیا تھا اور اسی طرح مسیحی مذہب سے تعلق رکھنے والے کو سپریم کورٹ کے پہلے چیف جسٹس مسٹر کارنیلسن اور فارن آفس میں ایس ایم برق کو نامزد کیا۔ ان کے چیف سیکیوریٹی افسر پارسی تھے۔ قائد اعظم نے دہلی میں تیئسویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمان گروہوں اور فرقوں کی نہیں اپنے اندر اسلام اور قوم کی محبت پیدا کریں کیونکہ ان برائیوں نے مسلمانوں کو دو سو برس سے کمزور کر رکھا ہے۔ مزید برآں یہ فرمایا کہ جس ملک کی آج ہم بنیاد رکھنے جا رہے ہیں اس میں ذات پات، نسل ومذہب کی بناء پر کسی سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا اور ہم سب ریاست کے برابر کے شہری ہیں۔ آخر میں پاکستان کے حکمرانوں کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹانے کے لئے اور منفی سوچ رکھنے والوں کے لئے قائد اعظم کا یہ خطاب اہم ہے جو 9/ جون 1947ء کو نئی دہلی کے امپریل ہوٹل میں آل انڈیا مسلم لیگ کے 445 مندوب جو قائد اعظم کے استقبال کے لئے جمع ہوئے تھے ان لوگوں نے جب قائد اعظم کو شہنشاہ پاکستان کے القاب سے ان کا استقبال کیا تو قائد اعظم نے اس کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ اس کو ہرگز نہ دہرایا جائے۔ '' میں تو پاکستان کا سپاہی ہوں شہنشاہ نہیں'' یہ میرے قائد کا جملہ آج کے حکمران جو اپنے آپ کو مسلم لیگی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ اے قائد اعظم تجھ پر لاکھوں سلام۔

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔
ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی،
معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ
تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق
اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

شعبہ پاکستان

خراب عدالتی نظام کا پوسٹ مارٹم

تحریر: خرم شہزاد

سانحہ ساہیوال کیس کا فیصلہ کیا آیا کہ ہر شخص نے عدالتوں کو فوج اور ججوں کو جرنیل سمجھ لیا اور جیسے آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے بچاؤ کے نام پر تقاریر کی جاتی ہیں، ویسے ہی خراب عدالتی نظام، بدبودار عدالتی نظام، انصاف کی عدم فراہمی، انصاف کے قتل، مظلوموں کے دشمن نظام جیسی بہت سی باتیں سوشل میڈیا اور دکانوں تھڑوں پر ہونے لگیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد لوگوں نے نہ تو عدالتی کارروائی کا جائزہ لیا، یعنی دوران سماعت عدالت گئے ہوں کہ پتہ کریں کیس کس رخ جا رہا ہے، سماعت کیسے ہو رہی ہے اور نہ ہی کسی نے عدالتی فیصلے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ دوران سماعت بھی پورے پاکستان سے کوئی سے تین اشخاص لے آیئے جنہوں نے گھر جا کر ہمدردی کا اظہار کیا ہو اور پتہ چلانے کی کوشش کی ہو کہ مظلوم خاندان کو کوئی مدد تو درکار نہیں۔

کسی اخبار یا چینل والے نے کیس کے دوران کو رتج نہیں کی اور نہ ہی اپنے ہر دم باخبر رکھنے کے دعوے پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کو بتانے کی کوشش کی کہ آج عدالت میں کیا کچھ ہوا۔ ویسے یہ وہی میڈیا والے ہیں جو دوسرے بہت سے کیسوں میں ہر دس سیکنڈ کے بعد بریکنگ نیوز دے رہے ہوتے ہیں کہ اب جج صاحب نے یہ جملہ ادا کیا، اب وکیل یہ بولا اور اب وہ وکیل کچھ نہیں بولا۔ لوگوں نے کیس کے فیصلے کی ایک لائن سنی اور حکومت سمیت عدلیہ پر چڑھ دوڑے۔ کسی نے یہ پوچھنے یا سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ عدالت کی ملزموں سے ایسی کون سی رشتے داری تھی کہ وہ سارے انصاف کے تقاضے بھلا کر انہیں رعایت دے رہی تھی۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ مدعی خود کیوں عدالتی فیصلے کو مان رہا ہے اور اسے سراپا احتجاج ہونے میں کیا چیز روک رہی ہے؟

کیا آپ یہ بات جانتے ہیں کہ ہماری عدالتوں میں بیٹھے ہوئے تقریباً ہر جج کا یہ کہنا اور ماننا ہے کہ وہ کیس کی پہلی تاریخ پر ہی سچ اور جھوٹ جان لیتا ہے۔ اسے پتہ چل جاتا ہے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا، کون واقعی مجرم ہے اور کسے صرف پھنسایا جا رہا ہے۔ روز بلکہ ہر گھنٹے ایک نیا تماشا دیکھتے ہوئے وہ جان لیتا ہے کہ کون دکھ سے رو رہا ہے اور کون صرف اداکاری کر رہا ہے۔ لیکن یہ سارے جج پھر بھی انصاف کی کرسیوں پر خاموش بیٹھے رہتے ہیں، کیونکہ ان کے سامنے جو کاغذ پیش کئے جاتے ہیں وہ کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے جو گواہ آتے ہیں ان کے بیانات کیس کو کوئی اور رنگ دے رہے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے کھڑے مدعی کچھ اور باتیں کر رہے ہوتے ہیں لیکن ان کے مقدمے کسی اور دفعہ کے تحت درج ہوئے ہوتے ہیں۔ ان ججوں کو وہ قانون کی کتابیں بھی باندھ کر رکھتی ہیں جن کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہماری عدالتوں میں سنائے جانے والے نوے فیصد فیصلے غلط تصور کیے جاتے ہیں۔

ان نوے فیصد میں سے ساٹھ سے ستر فیصد لوگ اگلی بڑی عدالت میں فیصلے کے خلاف رجوع کر لیتے ہیں اور باقی پیسوں کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے 'خدا کی یہی منشاء تھی' یا 'غریب کو اس دنیا میں انصاف نہیں مل سکتے' جیسے جملوں سے اپنا جیون گزار دیتے ہیں لیکن کبھی دل سے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ یہ سب نہیں جانتے، کیونکہ آپ نے یہ جملے فلموں میں سنے ہوتے ہیں اور عدالتیں دیکھی ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کو نہ تو عدالتی کارروائی سے کوئی مطلب ہوتا ہے اور نہ تفتیش کا کچھ پتہ ہوتا ہے۔ نہ آپ کو قانون کی خبر ہوتی ہے اور نہ کبھی آپ نے فیصلے کی وجوہات جاننے کی کوشش کی ہوتی ہے۔

چلیے ذرا آپ ہی تھوڑی دیر کے لیے جج بن جائیں اور بتائیں کہ سانحہ ساہیوال کا کیس آپ کے سامنے پیش ہوا ہے جس میں کارروائی کرنے والے پولیس اہلکاروں کو موقع پر دیکھنے کے باوجود کوئی شخص گواہ بننے کو تیار نہیں، تو آپ کیسے اور کس بنیاد پر کسی کو کوئی سزا دے سکتے ہیں۔ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ثبوت میں موجود چار لاشوں کی بنیاد پر اس دن ڈیوٹی پر موجود پولیس والوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے، لیکن قتل ہونے والے شخص کے رشتے دار قاتلوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

اب آپ کے سامنے لاشیں بھی موجود ہیں، اعترافی بیان دیئے ہوئے پولیس والے بھی، جن کے پہلو میں وہ شخص بھی کھڑا ہے جو مدعی ہے اور اب سب کو معاف کر چکا ہے۔ قانون کی کون سی شق کے تحت اب آپ بطور جج کسی کو سزا سنائیں گے؟ ابھی تو ہم نے نقلی دستاویزات اور جھوٹے گواہوں سمیت بہت سے وہ حربے جو ہماری عدالتی نظام اور کارروائی میں معمولی حیثیت رکھتے ہیں اور استعمال کیے جاتے ہیں، ان کا ذکر ہی نہیں کیا۔

میشا شفیع اور علی ظفر کا کیس بھی ایسی ہی ایک مثال ہے جس میں محترمہ نے کیس دائر کرتے ہوئے ایک بڑی رقم بطور ہرجانہ کا مطالبہ کر دیا۔ ہمیں یہاں نہ تو محترمہ کے کیس سے کوئی مسئلہ ہے اور نہ اس بات سے کہ ہرجانے کی رقم سے حراساں کیسے ختم ہو جاتی ہے لیکن ہمیں تو مسئلہ اس فضا سے ہے جو میشا شفیع کے الزام کے بعد پورے معاشرے میں قائم ہوئی۔ می ٹو کے نام پر خواتین کو کسی پر بھی کسی بھی طرح کا الزام لگا دینے کی سہولت سے مسئلہ ہوا۔ اس کیس کے دائر ہوتے ہی پورے ملک سے خواتین کے حقوق والی موم بتی مافیا جگہ جگہ جمع ہونا شروع ہوئی۔ بہت سے

می ٹو والے سامنے آئے اور کیمرے کی لائف کو انجوائے کرنے لگے۔ مردوں کے خلاف ہونے والی باتیں اس سے الگ تھیں اور ان باتوں سے ایسا تاثر ملتا تھا جسے ہر جگہ جہاں کوئی بھی مرد کسی بھی عورت کے آس پاس بھی نظر آتا ہے وہاں کوئی بھی عورت محفوظ نہیں۔ لوگ پوچھنے لگے کہ اگر اتنی شہرت کے مالک علی ظفر سے ایسا کام وہ بھی بہت سے لوگوں کی موجودگی میں ہوسکتا ہے اور وہ بھی اس خاتون کے ساتھ جو خود ایک اسٹار ہے تو کسی عام سی عورت کی زندگی کتنی غیر محفوظ ہوگی؟

کیس دائر ہوا اور آخر فیصلہ میشا شفیع کے خلاف آ گیا۔ کیوں؟ اس کیوں کو کسی نے کھوجنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میشا شفیع نے جو الزامات لگائے وہ قانون کی کس شق کے تحت قابل سزا بنتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے تنگ کرنے کے الزامات لگانے والوں نے کیس کن قانونی دفعات کے تحت لڑا تھا، عدالت میں کب کب اپنے بیان بدلے اور کب کب کس طرح کی استدعا کی۔ عدالتی کارروائی کس کس موڑ سے گزرتی ہوئی اس مقام پر پہنچی جہاں فیصلہ میشا شفیع کے خلاف آیا۔

نہیں، کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ یہ سب جانے۔ کیوں کہ ہم ایک تیز ترین زندگی کے دور میں جی رہے ہیں جہاں ایسی باتوں کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ایک اکثریت اس بات سے ہی لاعلم ہوگی کہ میشا شفیع کا پورا کیس ورکنگ وومن کی تنگ کرنے کے قانون سے لڑنے کی کوشش کی گئی، مگر نہ تو علی ظفر میشا کا باس ثابت ہوسکتا تھا اور نہ مس میشا خود کو علی ظفر کے پاس نوکری کرنا ثابت کرسکتی تھیں، لیکن پھر بھی پورا کیس ورکنگ وومن کی تنگ کرنے کے طور پر درج ہوا اور لڑا گیا۔

اب عدالت کو برا بھلا کہنے اور فیصلے کے خلاف بولنے والے خود بتادیں کہ کیسے فیصلہ عورت کے حق میں آسکتا تھا۔

یقیناً ہمارے عدالتی نظام میں بہت سی خرابیاں اور کمیاں ہیں لیکن اس نظام سے آتی ہوئی بدبو وہ کچرا ہے جو عام آدمی نے پھیلایا ہوا ہے۔ کہیں ذاتی انا اسے دوسروں پر کیس کرنے پر مجبور کر دیتی ہے تو کہیں وہ حالات کا رونا روتے ہوئے آخری لمحے میں اپنے بیان سے ہی بدل جاتا ہے۔ کہیں عدالت سے باہر باتیں کچھ اور ہوتی ہیں جبکہ کیس کسی اور دفع کے تحت درج ہوتا ہے اور کہیں ہمارے جھوٹے کاغذات اور گواہ ہی عدالت کے فیصلے پر اثر انداز ہوجاتے ہیں اور اس سب سے آخر میں ہمارا جاننا اور ماننا یہی ہوتا ہے کہ آج کی عدالت میں غریب کی کوئی جگہ نہیں اور آج کا عدالتی نظام کسی غریب کو انصاف نہیں دے سکتا۔

واقعی یہ نظام کبھی بھی کسی غریب چھوڑ امیر کو بھی انصاف نہیں دے سکے گا اگر ہم نے عدالتوں کا ایسے ہی تماشا بنائے رکھا یا پھر عدالتوں میں اپنے تماشے لگائے رکھے۔ اگر ہمیں انصاف چاہیے تو پھر سب کو سارے تماشے بند کرنے ہوں گے۔

London View Chambers

... your barristor

Skilled in Capital Markets & Securities; proficient in Corporate Finance; expert in Banking regulation; specialist in Competition policy & legislation; experienced in Public Law judicial review challenges; professionally qualified as Barristers in England and Advocates in Pakistan – Welcome to London View chambers.

Tel: 4797 7183 020

e-mail: clerks@londonviewchambers.co.uk

شعبہ پاکستان

سقوط حیدر آباد: مسلمان حاکم کی خواہش کے باوجود انڈیا کی یہ ریاست پاکستان کا حصہ کیوں نہ بن سکی؟

تحریر: رفیع رضا

یکم نومبر 1947، لاہور

انڈیا آزاد ہو چکا ہے، ایک نیا ملک پاکستان معرض وجود میں آ چکا ہے لیکن خطے کی تین بڑی ریاستوں کشمیر، حیدر آباد اور جوناگڑھ کا مستقبل غیر واضح ہے۔ ان تینوں ریاستوں نے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا ہے جبکہ انڈیا اور پاکستان ان کو اپنے ساتھ ملانے کی خواہش رکھتے ہیں۔

انڈیا کے آخری وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے گورنر جنرل اور قائداعظم محمد علی جناح کو یکم نومبر سنہ 1947 کو ایک تحریری تجویز پیش کی جس میں ان ریاستوں میں استصواب رائے کروانے کی بات کی جہاں کے حکمراں خطے کی اکثریت کے بجائے اقلیت سے آتے ہیں۔

حیدر آباد ریاست کے ساتویں فرمانروا میر عثمان علی نے 37 سال حکومت کی اور وہ اپنے وقت میں دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے تھے

ہر چند کہ یہ پیشکش بنیادی طور پر کشمیر کے لیے تھی لیکن انڈیا کے ماہر قانون اور کشمیر، حیدرآباد اور جوناگڑھ پر تین مختلف کتابوں کے مصنف و تجزیہ نگار اے جی نورانی کا کہنا ہے کہ ’محمد علی جناح نے تنازعے کے پر امن حل کا ایک بڑا موقع گنوا دیا اور ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔‘

ان کا کہنا تھا کہ اگر محمد علی جناح نے ماؤنٹ بیٹن کی تجویز مان لی ہوتی تو انھیں کشمیر ہاتھوں ہاتھ مل گیا ہوتا اور حیدر آباد میں کشت و خون کا بازار بھی گرم نہیں ہوتا۔

انھوں نے مزید کہا کہ محمد علی جناح کا خیال تھا کہ اگر انڈیا کے دونوں بازو کٹ جائیں تو وہ زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کا قلب نکال دو تو وہ جی نہیں پائے گا یعنی ان کے مطابق حیدر آباد ’انڈیا کا قلب‘ تھا۔

دوسری جانب حیدر آباد کو انڈیا میں ضم کروانے والے ہندو رہنما سردار ولبھ بھائی پٹیل نے حیدر آباد کو انڈیا کے ’دل کا ناسور‘ کہا اور اس کے آپریشن کو ضروری قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف فوجی کارروائی کروائی۔

دنیا کے امیر ترین شخص کی ریاست

یہ وہی حیدر آباد ہے جسے اس زمانے میں انڈیا کی خوشحال ترین ریاست کہا جاتا تھا جس کا خزانہ معمور تھا اور جو تہذیب و ثقافت کا گہوارہ کہلاتا تھا۔ یہاں گنگا جمنی تہذیب واقعتاً آباد تھی۔ یہ مختلف تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اس کے آبائی باشندگان مختلف زبانیں بولنے والے تھے، اگر ایک بڑا طبقہ تیلگو زبان کا حامل تھا تو دوسرا کنڑ بولتا تھا جبکہ ایک علاقے میں مراٹھی بولنے والے تھے اور ان سب کو اردو زبان جوڑتی تھی جسے 19 ویں صدی کے اواخر میں ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا گیا تھا۔

یہ برصغیر کا وہ خطہ تھا جہاں انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی اردو زبان کی ترویج اشاعت جاری تھی اور شاعروں اور ادیبوں کی پذیرائی کی جا رہی تھی۔ آصف جاہی خانوادے سے تعلق رکھنے والے نجف علی خان کا کہنا ہے کہ ان کے دادا حیدر آباد کے آخری نظام میر عثمان علی خان صدیقی عرف آصف جاہ (ہفتم) کی ریاست انڈیا میں سب سے بڑی ریاست تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے دادا نے ’37 سال تک بلا تفریق مذہب و ملت ریاست پر حکومت اور لوگوں کی خدمت کی۔‘

نظام حیدر آباد کے نام سے معروف عثمان علی خان اپنے زمانے میں دنیا کے امیر ترین شخص تھے جن کی دولت کا تخمینہ تقریبا 250 ارب امریکی ڈالر لگایا جاتا ہے۔

ان کے پاس زر و جواہرات کا وسیع خزانہ تھا جس میں 20 کروڑ امریکی ڈالر مالیت کا ایک 185 قیراط کا جیکب ہیرا بھی تھا جسے وہ پیپر ویٹ (کاغذ کو دبانے والے وزن) کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

تاہم رواں سال دو اکتوبر کو نظام حیدر آباد کے وارثوں اور انڈیا کے حق میں ساڑھے تین کروڑ پاؤنڈ کی خطیر رقم کا فیصلہ ہوا ہے جو کہ حیدر آباد کے انڈیا میں ضم کیے جانے سے قبل برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشنر کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کر دی گئی تھی اور اس وقت سے وہ وہیں جمع تھی جب کہ اس کے متعلق مقدمات جاری تھے۔

حیدر آباد کا انڈیا میں انضمام

نظام حیدر آباد کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے اور وراثت کے سلسلے میں 36 ویں نمبر پر آنے والے نواب نجف علی خان کا کہنا ہے کہ 17 ستمبر (1948) کے حملے کا زخم بہت گہرا ہے اور ابھی تک تازہ ہے۔ وہ یوم آزادی نہیں بلکہ قتل عام کا دن تھا جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جاتے ہیں۔

انڈین حکومت حیدر آباد کے حملے کو 'پولیس ایکشن' کہتی ہے جسے 'آپریشن پولو' بھی کہا جاتا ہے۔ انڈین حکومت کے مطابق یہ پولیس ایکشن ناگزیر تھا لیکن حیدر آباد کے سکالر سید علی ہاشمی نے اس کے جواب میں ایک کتاب اسی عنوان سے لکھ ڈالی ہے کہ اس حملے سے بچا جا سکتا تھا اور اس سے گریز ممکن تھا۔

محمد علی جناح اور جواہر لعل نہرو کے درمیان لارڈ ماؤنٹ بیٹن

ان کی کتاب 'اینیو ٹیبل انویژن: 1948 حیدر آباد' میں انھوں نے لکھا ہے کہ انڈیا میں 'برسر اقتدار گروپ یعنی انڈیا کے حکمراں ایک ترقی یافتہ ریاست (حیدر آباد) کو ہر حال میں انڈیا میں ضم کرنا چاہتے تھے۔'

یہی سوال جب سقوط حیدر آباد پر تحقیق کرنے والی پروفیسر اور حیدر آباد کے سینٹ اینز کالج میں صدر شعبۂ تاریخ ڈاکٹر اوما جوزف سے کیا گیا تو انھوں نے بی بی سی کو بتایا کہ 'ایک بار جب حیدر آباد اور انڈیا کے درمیان سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ (معاہدہ امتناع) طے پا گیا تو اس کے تحت حیدر آباد کو اپنی خارجہ پالیسی انڈیا کے حوالے کرنی تھی اور انھیں کسی دوسرے ملک سے براہ راست تعلق نہیں رکھنا تھا۔'

'لیکن نظام نے معاہدے کی پوری طرح خلاف ورزی کی۔ وہ بہت تیزی سے حیدر آباد میں اسلحہ جمع کر رہے تھے اور پاکستان کے ساتھ مستقل رابطے میں تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس خیال کو بھی پال رہے تھے کہ حیدر آباد پاکستان کا حصہ ہو سکتا ہے۔ انڈیا کے لیے یہ بڑی تشویش کی بات تھی کہ اگر حیدر آباد پاکستان میں شامل ہو جاتا ہے تو یہ انڈیا کے بیچوں بیچ ملک کے لیے مستقل پریشانی کا سبب ہو گا۔'

ڈاکٹر اوما جوزف نے مزید کہا کہ 'یہ کسی طرح قابل عمل نہیں تھا۔ جب مشرقی اور مغربی پاکستان زیادہ دنوں تک ایک ساتھ نہیں رہ سکے تو حیدر آباد کیسے رہ سکتا تھا کیونکہ وہ تو انڈیا کے بالکل درمیان میں تھا۔ اسی لیے سردار پٹیل نے حیدر آباد کو انڈیا کے پیٹ میں السرسے تعبیر کیا تھا۔'

حیدر آباد کی اس وقت کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے زمانے کے ممتاز عالم سید ابوالاعلی مودودی نے اپنے رسالے 'ترجمان القرآن' کے سنہ 1948 کے پانچویں اور دسمبر کے شمارے میں لکھا: 'تقسیم کے بعد حیدر آباد انڈین یونین کے گھیرے میں آ چکا تھا اس لیے نہ باہر سے کوئی بڑی مدد اس کو پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی اندر اس کا کوئی امکان تھا۔

'ان حالات میں کوئی ہوش مند انسان یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں 85 فیصدی غیر مسلم اکثریت پر 15 فیصد مسلم اقلیت کا وہ غلبہ و اقتدار برقرار رکھا جا سکتا ہے جو پہلے بالکل مختلف حالات میں قائم ہوا اور رہا تھا اور کسی مرد عاقل سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ حیدر آباد انڈین یونین سے لڑ کر اپنی خود مختاری قائم نہیں رکھ سکتا۔

'دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان کشمکش، مزاحمت اور جنگ کے بجائے اپنے مستقبل کے لیے کوئی ایسی راہ تلاش کرتے جس میں وہ کامل تباہی سے بچ بھی سکتے اور آئندہ اپنی اخلاقی و دینی حالت کو بہتر بنا کر کوئی نتیجہ خیز جدوجہد کرنے کے مواقع بھی انھیں حاصل رہتے لیکن جن لوگوں نے ایسی کوئی راہ سوچی اور بتائی وہ مسلمانوں کو دشمن نظر آئے۔ انھوں نے اپنی رہنمائی کے لیے ایسے لوگوں کو پسند کیا جو اندھے جوش، کھوکھلے نعروں، جھوٹی توقعات غلط امیدوں، بے بنیاد آرزوؤں اور بے زور لاف و گزاف کے ذریعہ سے ان کے غرورِ نفس کو فی الوقت تسکین دے سکیں۔

'وہ اس آواز پر مرمٹے کہ کوئی دِلی کے لال قلعہ پر آصف جاہی جھنڈا اگاڑ دینے کی بات تو کرتا ہے۔ اس نشے میں 40 لاکھ کی پوری آبادی مست ہو گئی۔ کوئی یہ سوچ کر اپنے وقتی لطف کو کرکرا کرنے پر راضی نہ ہوا کہ آخر یہ کام ہو گا کس طرح، سب کے سب آنکھیں بند کر کے اس لاف زنی کے پیچھے چل پڑے اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی انھیں ایسے بے نظیر لیڈر میسر

آتے ہی چلے جاتے ہیں!'

مولانا مودودی نے کسی شخص کا نام نہیں لیا لیکن نظام حیدرآباد کو بے بنیاد مشوروں سے نوازنے والوں کو نشانہ بنایا۔

دوسری جانب اے جی نورانی نے قاسم رضوی اور لائق علی کے ساتھ محمد علی جناح کا نام لیا۔ قاسم رضوی کی شعلہ بیان تقاریر نے نظام حیدرآباد کو اتنی جھوٹی امیدیں بندھا رکھی تھی کہ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ ایک دن نظام کا پرچم دہلی کے لال قلعے پر لہرائے گا۔

حیدرآباد میں محمد علی جناح کے کردار کے بارے میں مسٹر نورانی نے کہا: 'محمد علی جناح نے ہندوستان سے انتقام لینے کے لیے اپنے آدمی میر لائق کو حیدرآباد میں پروموٹ کیا۔ ان سے ان کے تجارتی تعلقات بھی تھے۔ محمد علی جناح نے غالباً مارچ 1947 میں حیدرآباد میں دو لاکھ روپے کی سرمایہ کاری بھی کی تھی۔'

مسٹر نورانی نے محمد علی جناح کے چار اگست 1947 کے ایک انٹرویو کا ذکر کیا جو دہلی کے منٹس میں شامل ہے اور حیدرآباد پر ان کی کتاب 'دی ڈسٹرکشن آف حیدرآباد' میں بھی شامل ہے۔

کتاب میں شامل ضمیمے میں رقم ہے کہ 'محمد علی جناح نے کہا کہ ان کا خیال یہ ہے کہ عالی جاہ (نظام حیدرآباد) اور ان کے مشیروں نے انضمام کے خلاف اپنا ذہن بنا لیا ہے تو انھیں مضبوطی اور وفاداری کے ساتھ اس پر جمنا چاہیے۔ خواہ وہ (انڈیا) کوئی بھی معاشی پابندی کیوں نہ عائد کرے، عالی جاہ کا اس بات پر زور ہونا چاہیے کہ 'آپ چاہے جو کرلیں، جس طرح چاہو دھمکالیں، لیکن میں انضمام کے کاغذات یا یونین میں شامل ہونے پر اس وقت تک رضامند نہیں ہوسکتا جب تک میرا ضمیر نہیں کہتا۔ آپ کو مجھے مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں اور مجھے اپنا فیصلہ لینے حق حاصل ہے۔'

مسٹر نورانی کی کتاب میں شائع منٹس کے مطابق محمد علی جناح نے یہاں تک کہا کہ 'اگر حالات انتہائی خراب ہوجائیں تو اپنے بنیادی اصولوں سے انحراف کرنے کے بجائے لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ بہتر ہے۔'

محمد علی جناح نے تاریخ کی سب سے بڑی شہادت یعنی امام حسین کی شہادت کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ حق کے لیے جان دینا کتنی اہمیت کا حامل ہے۔

اے جی نورانی نے بہر حال نظام کی پالیسیوں کو حیدرآباد کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ 'نظام انتہائی بے وقوف انسان تھے اور انھیں قاسم رضوی جیسا شخص مل گیا یعنی سونے پر سہاگہ۔ انھیں جولائی 1948 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک بہترین تجویز دی تھی جسے انھوں نے مسترد کر دیا۔'

جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ بہترین تجویز کیا تھی، تو انھوں نے کہا کہ اس میں 'حیدرآباد کو بیرون ممالک سے رابطہ کرنے کی اجازت تھی۔'

دوسری جانب سید ہاشم علی نے انڈیا کی جانب سے معاشی پابندیوں اور ریاست حیدرآباد کے 'اہم عہدوں پر فائز افراد کی غداریوں' کو بھی سقوط حیدرآباد کا سبب کہا ہے۔

دوسرے مورخین کا کہنا ہے کہ اس میں کمیونسٹوں کی تحریک اور ریاست کے کانگریسیوں کا بھی دخل ہے جنھوں نے انڈین قیادت کو گمراہ کن اشارے دیے۔

جنرل العیدروس (دائیں) جنرل چودھری کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے

آپریشن پولو

حیدرآباد کی اکثریتی آبادی ہندو مذہب کی ماننے والی تھی اور وہاں کانگریس کے حامی انڈیا سے الحاق چاہتے تھے۔ دوسری جانب کمیونسٹوں کی تلنگانہ تحریک تھی۔

جبکہ پروفیسر اوماجوزف کا کہنا ہے کہ وہاں متعدد قسم کے اختلافات تھے۔ زمین داری کے خلاف کسانوں کی تحریک تھی، زبان کا مسئلہ تھا، یہاں تک کہ ملکی یعنی دیسی اور غیر ملکی کا بھی جھگڑا جاری تھا۔'

اوماجوزف کے مطابق حیدرآباد میں شمالی انڈیا کے لوگوں کا تسلط تھا اور حیدرآباد ریاست کے لوگ اس کے خلاف تھے۔ ریاست کے باہر کے لوگوں کو غیر ملکی کہا جاتا تھا۔ ان تمام چیزوں نے نظام حیدرآباد کو اپنی فوج کو مستحکم کرنے کی جانب متوجہ کیا۔

دوسری جانب تقسیم ہند سے ابھرنے والے خلفشار کے دوران یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ نظام حیدرآباد، گوا میں پرتگالیوں اور پاکستان کی مدد سے خود کو مسلح کر رہے ہیں۔ اس خبر پر سردار پٹیل نے کہا کہ انڈیا میں ایک آزاد حیدرآباد کا وجود ناقابل برداشت ہے اور اسے ختم کرنا لازمی ہے۔

چنانچہ انڈیا نے حیدرآباد کو اپنی ریاست بنانے کے لیے 36 ہزار مسلح فوج اتاری جبکہ دوسری جانب نظام حیدرآباد کے پاس صرف 24 ہزار فوج تھی اور اس میں بھی پوری طرح سے تربیت یافتہ فوجیوں کی تعداد محض چھ ہزار تھی جس میں عرب، روہیلا، پٹھان، ہندو اور دیگر مسلمان شامل تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے علاوہ ریاست کے پاس تقریباً دو لاکھ رضا کار تھے جن کی کمان قاسم رضوی کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ یہ سب غیر تربیت یافتہ افراد تھے جو نظام حیدرآباد سے وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

انڈین فوج نے جنوبی کمان کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ای این گوڈارڈ کی سربراہی میں حیدر آباد کے خلاف مختلف اطراف سے محاذ کھول دیے۔ مغرب میں ان کا رخ وجے واڑا کی جانب تھا تو مشرق میں شعلہ پور پر ان کی توجہ مرکوز تھی۔

13 ستمبر 1948 کو حیدر آباد پر جو حملہ کیا گیا وہ صرف پانچ دنوں میں اختتام پذیر ہوا اور 18 ستمبر کو نظام کے کمانڈر ان چیف سید احمد العیدروس نے باضابطہ ہتھیار ڈال دیے۔

جب ہم نے پروفیسر اوما جوزف سے سوال کیا کہ کیا پاکستان کی جانب سے حیدر آباد کے لیے کوئی مدد نہیں آئی تو انھوں نے کہا کہ 'پاکستان میں ان دنوں سوگ کا ماحول تھا۔ 11 ستمبر کو بانی پاکستان محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے وہاں سے کوئی مدد نہیں آ سکی۔'

کہا جاتا ہے کہ قاسم رضوی کی قیادت میں دو لاکھ رضا کار تھے لیکن سب کے سب غیر تربیت یافتہ تھے

انھوں نے مزید کہا: 'سرکاری یا تاریخی شواہد تو نہیں ملتے لیکن جب ہم نے بہت سے لوگوں سے انٹرویو کیا تو انھوں نے کہا کہ نظام اور ان کے بہت سے وزرا یہاں تک کہ اس وقت کے وزیر اعظم میر لائق پاکستان کے ساتھ مستقل رابطے میں تھے اور انھیں امید تھی کہ اگر ایسی کوئی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو انھیں پاکستان سے مدد ملے گی۔ انھوں نے بتایا کہ جب انڈیا کے ساتھ انضمام کی تحریک جاری تھی تو نظام نے وہاں اخباروں کی اشاعت پر پابندی لگا دی تھی لیکن پاکستان سے شائع ہونے والے اخبار وہاں دستیاب تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا کتنا اچھا رشتہ تھا۔'

انھوں نے کہا کہ انٹرویوز کے دوران انھیں 'بہت سے لوگوں نے یہ بتایا کہ سردار پٹیل نے حملے کے لیے 13 ستمبر کی تاریخ اس لیے طے کی کہ ایک دن پہلے محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور اس لیے وہاں سوگ کا ماحول تھا اور ایسے کوئی شواہد نہیں ہیں کہ پاکستان نے وہاں سے کوئی مدد بھیجی تھی۔ البتہ یہ باتیں سامنے آئیں کہ نظام کے بہت سے قریبی افراد حملے سے قبل پاکستان منتقل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔'

ہر چند کہ فوجی کارروائی پانچ دنوں تک ہی رہی لیکن اس میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور دیہی علاقوں میں فسادات کا بازار گرم رہا۔ یہاں تک کہ انڈیا کے اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے انڈین فوجیوں کی جانب سے شہریوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے گولی مارنے کی اطلاعات کے بعد فوجی کارروائیوں کی تحقیقات کے لیے سندر لال کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی۔

نواب نجف علی خان کا کہنا ہے کہ حکومت ہند نے سندر لال کمیٹی کی رپورٹ کی بروقت اشاعت نہیں کی اور اسے اب تک پارلیمان میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔

بہر حال اس رپورٹ میں 27 ہزار سے 40 ہزار کے درمیان لوگوں کے مارے جانے کی بات کہی گئی ہے جبکہ بعض دیگر تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ انڈیا کی اس کارروائی اور اس سے پیدا ہونے والے فسادات میں دو لاکھ سے بھی زیادہ افراد مارے گئے تھے۔

نجف علی خان کا کہنا ہے کہ حیدر آباد پر حملے کی سچائی کے لیے سندر لال کمیٹی کو منظر عام پر لانا ضروری ہے۔ انھوں نے انڈین حکومت سے سوال کیا کہ کوئی ریاست اپنے بادشاہ سے آزادی کیوں چاہے گی جب اس نے اپنی رعایا کے خلاف کوئی جرم نہیں کیا ہو۔

انھوں نے سوال کیا کہ حیدر آباد کو انڈیا میں ضم کرنے کے بعد نظامِ حیدر آباد کے خلاف کوئی مجرمانہ کارروائی کیوں نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس انھیں وہاں کا 'راج پرمکھ' یعنی گورنر کیوں بنایا گیا؟

اس کے بعد حیدر آباد کے معاملے کو اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا لیکن وہاں اتنی تاخیر ہوئی کہ وہ اپنی موت آپ مر گیا۔ دسمبر 1949 کو نظام حیدر آباد نے ایک سند جاری کی جس میں کہا گیا کہ انڈیا کا مستقبل کا آئین ہی حیدر آباد کا آئین ہو گا اور پھر ریاست حیدر آباد بالآخر 26 جنوری سنہ 1950 کو باقاعدہ انڈیا کا حصہ بن گیا۔ یہی وہ دن ہے جب انڈیا میں آئین نافذ کیا گیا۔

اس کے بعد بھی میر عثمان علی خان انڈیا کے امیر ترین شخص تھے۔ ان کے ایک پوتے نجف علی خان کا کہنا ہے کہ جب 1965 میں انڈیا کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے حیدر آباد کا دورہ کیا تو انھوں نے قومی دفاع کے فنڈ میں میر عثمان علی خان سے دل کھول کر عطیہ دینے کی گزارش کی۔ یہ فنڈ چین کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں قائم کیا گیا تھا۔ اس فنڈ میں میر عثمان علی خان نے 5000 کلو سونا عطیہ کیا جو آج کے اعتبار سے 1600 کروڑ روپے ہوتا ہے۔

نجف علی خان کا کہنا ہے کہ انڈیا کی تاریخ میں اتنا بڑا عطیہ کسی نے نہیں دیا لیکن اس کے ساتھ ان کا کہنا ہے کہ انڈیا نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

نفرت و انتقام کی سیاست جذبۂ انسانیت پر غالب آچکی

لاہور انٹرنیشنل نیوز ڈیسک

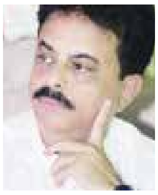

تحریر: احسان ابڑو

عفو و درگزر اللہ ربّ العزّت اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد پسند ہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے کہ میرے بندوں کی خطائیں اسی طرح معاف کیا کرو جیسے میں تمہاری خطائیں معاف کرتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ عفو و درگذر، انسانیت کی بھلائی، پورے عالمِ انسانیت کی رحمت کا انتہائی اعلیٰ و ارفع نمونہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو اپنی زندگی کا سب سے اہم شعار بنانے کے واضح احکامات اور تعلیمات دی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جو اچھا انسان بننے کی خصلت سے محروم ہے وہ کبھی اچھا مسلمان نہیں بن سکتا۔ آج ارضِ پاک سیاسی عدم استحکام، عدم برداشت کی وجہ سے جن معاشرتی برائیوں کے بدترین دور سے گذر رہی ہے ان کی سب سے بڑی وجہ انسانیت اور انسانی جذبوں اور انسانی حقوق سے انحراف ہے۔

اللہ ربّ العزّت جب پیڑ میں پھل لگاتا ہے تو پیڑ جھک جاتا ہے اسی طرح کسی انسان کو اگر کوئی ایسا منصب مل جائے جو خلقِ خدا کی خدمت سے تعلق رکھتا ہو تو اسے انسانیت کی تعظیم میں جھک جانا چاہیے۔ اسے خلقِ خدا کی خدمت میں جھک جانا چاہیے۔ آج دنیا میں انسانوں کے درمیان جو طبقاتی تقسیم اور ان کے درمیان جو حقوق کی ناہمواری پائی جاتی ہے اس کی بدترین مثال بااثر طاقتور طبقات یا حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی جانب سے کمزور اور اپنے مخالفین کو مغلوب کرنے کی مادی خواہشات ہیں۔ جبکہ اسلام کے عادلانہ نظام میں تمام انسانی طبقات کے لیے مثالی توازن و ہم آہنگی اور ان کے حقوق و جذبات کی ہر ممکن آسانی پائی جاتی ہے۔

اسلام نے اپنی تمام تعلیمات میں قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک انہیں عام آزاد انسانوں کو حاصل سہولیات، ان کے کھانے پینے ان کے علاج معالجے، ان کے آرام ان کی عزت و احترام غرض ہر پہلو میں اعلیٰ انسانی قدروں کو عادلانہ نظام میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ ”قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت قبول کرو“ مگر یہاں ہمارے وزیرِ اعظم صاحب کے معاملات ہی دوسرے ہیں تکبر، رعونت ان کے انگ انگ سے جھلکتی ہے، ”میں“ ان کے کردار کا خاصہ ہے، ذاتی و سیاسی مخالفین کی تکلیف سے دلی روحانی تسکین کا حصول ان کی طبیعت، عادت اور فطرت کا حصہ نظر آتا ہے۔ ان کے سارے بیانئے میں سوائے سیاسی مخالفین کے خلاف احتساب کی آڑ میں انتقام کے، مفت و بہترین تعلیم وصحت کی فراہمی، اداروں کی مضبوطی اور ان میں تعیناتی میں شفافیت اور میرٹ لانے، پولیس و عدلیہ میں اصلاحات، بیروزگاری ختم کرنے، بے گھروں کو چھت فراہم کرنے، سمیت دیگر ان گنت وعدے اور دعوے کہیں نظر نہیں آتے۔

خان صاحب مخالفین سے انتقام میں اتنے آگے نکل گئے کہ تمام اگلے پچھلے ریکارڈ ہی توڑ ڈالے، ان کے غصے نفرت کا شکار پاکستان کے دو ایسے سیاسی رہنما ہیں جو ان کے انتقام کی آگ میں جھلس کر خدانخواستہ موت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ یہ دونوں قیدی جن میں ایک ملک کے سابق منتخب صدر آصف علی زرداری ہیں اور ایک ملک کے تین بار منتخب وزیرِ اعظم میاں نواز شریف ہیں۔ میاں صاحب اور زرداری صاحب اس وقت خان صاحب کی بدترین نفرت و انتقام کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، ایک ایسے انتقام کا شکار جس نے انسانیت کو ہی شرمسار کیا ہوا ہے۔

میاں صاحب ایک کیس میں اقامہ کی بنیاد پہ سزا کاٹ رہے ہیں تو ایک بار پھر انہیں ایک اور مقدمے میں نامزد کر کے انہیں جیل سے نیب کی تحویل میں دے دیا گیا ہے، جبکہ آصف علی زرداری جعلی اکاؤنٹس کے ذریعے منی لانڈرنگ کے ایسے الزام میں پابند سلاسل ہیں جس میں نہ تو مقدمہ بنا ہے نہ ہی کوئی ثبوت یا شہادت ملی ہے۔ ان کے خلاف، مگر محض ایک شخص کی ذاتی انا اور سیاسی بیانیے کو تقویت پہنچانے کے لیئے ملک کے سابق صدر و سابق وزیرِ اعظم کو نشانِ عبرت بنانے کی پوری کوششیں جاری ہیں۔ ان کے اسی جارحانہ و انتقامی رویوں کے باعث نیب اب ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔

نیب نے ملکی تاریخ میں بدترین یک طرفہ احتساب کی وہ مثالیں قائم کی ہیں جس کی نظیر اس سے پہلے ملکی تاریخ میں نہیں ملتی۔ نیب کی انہیں کارروائیوں کے خلاف وفاقی سیکریٹریز کی تنظیم نے بھی نیب کے خلاف اپنے شدید تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے نیب کو ملکی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہوئے نیب قانون میں فوری تبدیلی اور نیب کو اپنے دائرہ اختیار میں رکھنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اسی انتقام و احتساب کے کھیل میں ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین کی زندگیوں کو خطرات لاحق ہو چکے ہیں، ایک موت کے دروازے پہ دستک دیتا نیب کی تحویل سے ہسپتال میں موت سے لڑ رہا ہے تو دوسرا ہسپتال میں اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے بل پر زندگی کے لیے پر امید، مگر خان صاحب جیسے سیاسی مخالف سے کسی بھی قسم کی رعایت یا رحم کی درخواست کرنے سے انکاری ہے۔

وزیرِ اعظم صاحب کو ان کے اپنے پرائے بارہا یہ مشورے دیتے نظر آتے ہیں کہ خان صاحب اب ڈھونگ رچانا چھوڑیں اور ملک کی تباہ حال معیشت، اخلاقی پستیوں کی کھائی میں گرتی معاشرتی سماجی اور سیاسی صورتحال کی جانب توجہ مرکوز کریں، مگر خان صاحب کسی آواز کسی مشورے کو اہمیت دینے کے لیئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد نظر آتا ہے اور وہ ہے ہر حالت میں اپنے مخالفین اپنے سیاسی حریفوں کو کرپشن احتساب کے نام پہ سیاسی منظرنامے سے ہمیشہ کے لیئے دور کر دینا اور انہیں اتنا کمزور کر دینا کہ کوئی ان کے سامنے سر اٹھا کے چل ہی نہ سکے۔

دوسری طرف خان صاحب کی لفظی گولا باری بریگیڈ کی سرخیل فردوس عاشق اعوان سمیت کچھ دیگر وزراء اور اراکین مسلسل میاں صاحب اور زرداری صاحب سمیت دیگر مخالف سیاسی قیدیوں کی صحت کو طنز و تنقید کی زد پہ لیے ہوئے ہیں جو کہ انتہائی قابلِ مذمت گھٹیا حرکت کے زمرے میں آتی ہے۔ خان صاحب نے شاید اپنے گولا باری جتھوں کو دونوں قائدین کی صحت پہ تنقید سے منع بھی کیا ہے، مگر اگر یہی اقدامات معاملات کے اس نہج پہ پہنچنے سے پہلے ہی اٹھائے جاتے تو شاید آج جس شدید ترین تنقید کا سامنا خان صاحب اور ان کی حکومت کو درپیش ہے وہ نہ ہوتا۔

خان صاحب کو انسانیت اور اسلامی قدروں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری صاحب کی زندگیوں کو لاحق خطرات، ان کی صحت کو درپیش مسائل اور ان کے علاج معالجے کی بہترین سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنانے کے اقدامات کو یقینی بنانا چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ دونوں قائدین کی زندگیوں کے ساتھ کوئی سانحہ رونما ہوگیا تو نہ صرف ملک کی یکجہتی، سالمیت اور استحکام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے بلکہ اس کا خمیازہ بھی پھر بحیثیت وزیرِ اعظم خان صاحب کو ہی ادا کرنا پڑے گا جو یقیناً ان کے سیاسی کیریئر کے لئے تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

میں تو اچھا ہوں تم برے ہو

تحریر: وسعت اللہ خان

ایک لفظ ہے ” سیلف پریزرویشن “ یعنی ”خود حفاظتی“ یعنی ” یا شیخ اپنی اپنی دیکھ “ یعنی ” پہلے میں، پھر اعزا و اقارب اور پھر دیگر “۔ اگر ہم عمومی سیاست بالخصوص پاکستانی سیاست و سماج کو سیلف پریزرویشن کے عدسے سے دیکھیں تو کچھ اور ٹپائی ہی نہیں دے پاتا۔ اور یہ سب کاروبار عام آدمی کے نام پر ہوتا ہے، ہو رہا ہے اور شائد ہوتا رہے گا۔

ریاست کی لیز عام آدمی کے نام پر ہے مگر اس لیز کی پاور آف اٹارنی سوائے عام آدمی کے ہر کوئی استعمال کر رہا ہے۔ ابراہام لنکن سے منسوب یہ قول تو ہر ذرا سے پڑھے لکھے نے سنا ہوگا کہ جمہوریت عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو برائے عوام ہے۔

لیکن اس قولِ لنکن کی عملی اطلاقی صورت کچھ یوں بنتی ہے کہ جمہوریت (یا جمہوریت کے نام پر کوئی بھی اصلی یا جعلی طرزِ حکومت) ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو طاقتور لوگ عوام کے نام پر برائے خود تشکیل دیتے ہیں اور پھر عوام پر حکومت کر کے سیلف پریزرویشن یا ذاتی، مفاداتی، طبقاتی و اداراتی تحفظ کرتے ہیں۔ بدلتا ہے تو صرف اسٹیکر۔

ہر سرکردہ فرد اور ادارہ عوامی فلاح و بہبود کے بارے میں نہ صرف ہمہ وقت سوچنے کا دعویدار بلکہ کمربستہ ہے جب کہ عوام دست بستہ۔ ہمارا آئین برطانوی آئین کی طرح زبانی نہیں تحریری ہے اور اس کے ابتدائیے میں ہی لکھ دیا گیا ہے کہ ریاست کی نگاہ میں ہر شہری بلا امتیازِ طبقہ، علاقہ، نسل، رنگ و جنس و عقیدہ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

پارلیمنٹ ہر قانون عوام کی سہولت و ترقی و تحفظ کے لیے بناتی ہے حکومت بھلے خاکی ہو کہ نوری، مساواتِ محمدی کی علمبردار ہو یا ریاستِ مدینہ کے قیام کی وکیل۔ ہر آرڈیننس جاری کرتے ہوئے یہی کہتی اور سوچتی ہے کہ اس سے عام آدمی کا مزید بھلا کیسے ہو سکتا ہے
۔

کبھی آپ نے ریاستی اداروں کے شاخِ زیتون والے سرکاری نشانات کے اوپر نیچے یا درمیان میں درج نعروں یا ماٹوز پر دھیان دیا ہے حکومتِ پاکستان کا ماٹو ہے ” ایمان، اتحاد، نظم “۔ قومی اسمبلی کا ماٹو ہے ” جمہوریت، حاکمیت، مساوات “۔ پولیس کا ماٹو ہے ” خدمت اور حفاظت “۔ فوج کا ماٹو ہے ” ایمان، تقوی، جہادِ فی سبیل اللہ “۔ سپریم کورٹ کا ماٹو ہے ” فاحکم بین الناس بالحق “ یعنی لوگوں کے فیصلے انصاف کی بنیاد پر کرو۔ الیکشن کمیشن کا ماٹو ہے ” انتخابات، آزادانہ، منصفانہ، غیر جانبدارانہ “۔ پاکستان کسٹمز کا ماٹو ہے ” دیانت، صلاحیت، اخلاق “۔

پنجاب پولیس کا ماٹو ہے ”خدمت اور حفاظت“۔ پنجاب پولیس نے ہر ضلع میں خدمت مرکز اور خدمت کاؤنٹر بھی کھول رکھے ہیں۔ سندھ پولیس کا ماٹو ہے ”خدمت کے لیے کوشاں “۔ بلوچستان پولیس کا ماٹو ہے ” امر بالمعروف نہی عن المنکر “۔ خیبر پختون خوا پولیس کا ماٹو ہے ” خدمت، عبادت، پاسبان “۔ پی آئی اے کا ماٹو ہے ”باکمال لوگ لاجواب پرواز “۔

یعنی سب اچھا ہے۔ نیت بہترین ہے، مقاصد اعلیٰ ہیں مگر ناشکرے عوام پھر بھی کوسناپے کی عادت میں مستقل مبتلا ہیں۔ ہر سیاسی جماعت صرف اور صرف اس لیے بااختیار ہونا چاہتی ہے تاکہ عوام کی زندگیوں کو خوشحال و خوش باش بنا سکے۔

ہر تنظیم ذاتی و تنظیمی مفاد سے بالاتر اور اپنے محلے، قصبے، شہر، صوبے، علاقے، برادری، طبقے اور فرقے کی خدمت کے لیے سرشار ہے اور اس کی زلفوں سے بے لوثیت کا شیرہ ٹپک رہا ہے۔ مگر مسائل ہیں کہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں، احسان فراموش لوگ روزمرہ سے تنگ آتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

البتہ کوئی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ سامنے والا پیچھے ہٹے۔ کوئی خود کو بدلنے پر آمادہ نہیں جب تک مدِ مقابل خود کو نہ تبدیل کرے۔ کوئی غلطی ماننے کو تیار نہیں کیونکہ غلطی میری ہے ہی نہیں۔ گر ہے بھی تو تیری۔ کوئی اعتراف کرنے پر راضی نہیں کیونکہ اعتراف میں بے عزتی ہے۔ کوئی دوسرے کو عزت دینے کے لیے پہل پر آمادہ نہیں کیونکہ سب کی ناک سب سے اونچی ہے۔ کوئی سیکھنے کو تیار نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے پرفیکٹ (مثالی) ہے۔

اگر آپ کہیں کہ کرپشن بڑھ گئی ہے تو جواب ملتا ہے نائجیریا سے تو کم ہے۔ کراچی میں اسٹریٹ کرائم پھر بڑھ رہے ہیں تو کہا جاتا ہے پچھلے دور سے تو کم ہیں کیا تم نے نیویارک کا تازہ ترین کرائم ڈیٹا نہیں دیکھا۔

کراچی میں گندگی کے ڈھیر لگے ہیں کوئی ذمے داری لینے کو تیار نہیں تو کہا جاتا ہے کہ آپ پھر بھارت نہیں گئے وہ تو ہم سے بھی زیادہ گندے ہیں۔ میڈیا کا مسلسل بالواسطہ و بلاواسطہ گلا گھونٹا جا رہا ہے تو جھٹ مثال دی جاتی ہے کہ آپ مغرب کی طرف کیوں دیکھتے ہیں شکر کریں پاکستان میں مصر، وسطی ایشیا اور خلیجی ممالک سے زیادہ آزادی ہے۔

پاکستان کی معیشت جام کیوں ہے اور بنگلہ دیش ہم سے آگے کیوں ہے؟ ارے صاحب بنگلہ دیش کی مثال مت دیں۔ اگر مغربی ممالک سلے سلائے کپڑے خریدنا بند کر دیں تو بنگلہ دیشی معیشت ایک ہفتے میں دھڑام سے گر جائے۔

مگر ویتنام، ملائیشیا، انڈونیشیا، ترکی اور کوریا ہم سے آگے کیوں ہیں جب کہ ساٹھ برس پہلے ہم سے پیچھے تھے۔ ارے میاں آپ بھی کمال کرتے ہیں، جتنی دہشت گردی، جتنی بیرونی سازشوں کا ہم سامنا کر رہے ہیں اگر ان میں سے کسی ملک کو درپیش ہوتیں تو نانی یاد آجاتی۔

مغرب، چین اور جاپان کی مثال اس لیے نہیں دے سکتے کہ پھر ترنت کہا جاتا ہے کہ بھائی آپ احمقوں کی جنت سے نکلیے۔ ہم تیسری دنیا کے ملک ہیں مغرب کی مثالیں ہم پر صادق نہیں آتیں۔

جتنی توانائی مسئلہ حل کرنے سے زیادہ سامنے والے کو خاموش کرانے اور اور خود کو درست ثابت کرنے میں صرف کر دی جاتی ہے۔ اس سے نصف توانائی اگر سچائی کا سامنا کرنے اور پھر حکمتِ عملی بنانے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں کھپائی جاتی تو آج مجھے ایسی اول جلول گفتگو نہ کرنا پڑتی۔

دراصل ہمارا ماٹو یہ ہونا چاہیے کہ جب ہم ترقی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بار بار ترقی کرنے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ موٹو پسند نہیں تو پھر یہ کیسا رہے گا ” کام جوان کی موت ہے “۔ (بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

جھوٹے مقدمات کو روکنے میں پاکستان کا قانون کتنا موثر؟

تحریر: شہزاد ملک

پاکستان میں ایسے ہزاروں مقدمات ہیں جن میں ملزمان سالہا سال جیلوں میں گزارتے ہیں اور اس کے بعد اعلیٰ عدلیہ اُن مقدمات میں شواہد کی عدم موجودگی کی وجہ سے ملزمان کو بری کر دیتی ہیں۔

توہین مذہب کے مقدمات کی ہی مثال لے لیں تو حال ہی میں سپریم کورٹ نے ایک ملزم وجیہہ الاحسن کو رہا کیا ہے جو گذشتہ 20 سال سے جیل میں قید تھا۔ اس کے علاوہ گذشتہ برس توہین مذہب کے مقدمے میں رہائی پانے والی آسیہ بی بی کو بھی نو سال بعد آزادی ملی۔

ان دنوں مقدمات کے مدعیوں کے خلاف ابھی تک ریاست کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوسکی۔

ایک مقدمے کے مدعی خود وکیل ہیں جبکہ دوسرے مقدمے کے مدعی مقامی مسجد کے امام ہیں۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ ان دونوں مقدمات کے مدعیوں کا تعلق ایسے شعبوں سے ہے جن کے خلاف کارروائی کرنا شاید کسی بھی حکومت کے بس کی بات نہیں ہے۔

جو افراد جھوٹے مقدمات میں اپنی زندگی کا ایک حصہ جیلوں میں گزار دیتے ہیں تو پاکستان کی کوئی بھی عدالت یا کوئی بھی قانون جیل میں گزاری جانے والی اس مدت کا ازالہ نہیں کرسکتا۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا پاکستان میں ایسا کوئی قانون موجود ہے جس کے تحت جھوٹے مقدمات درج کروانے والوں کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جاسکے۔

تعزیرات پاکستان کی شق 182

تعزیرات پاکستان کی ایک شق 182 ہے جو کہ غلط مقدمہ درج کروانے سے متعلق ہے، یعنی اگر کسی نے اپنے کسی مخالف کے خلاف مقدمہ درج کروایا ہے اور عدالت میں یہ مقدمہ ثابت نہیں ہوا تو مدعی مقدمہ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

پاکستان کی ماتحت عدلیہ کی تاریخ میں دو درجن سے زیادہ سنگین نوعیت کے مقدمات ایسے ہیں جن میں جھوٹا مقدمہ درج کروانے پر مدعی مقدمہ کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی گئی ہے لیکن اس میں کسی بھی شخص کو تین ماہ سے زیادہ سزا نہیں سنائی گئی۔

یہ وہ مقدمات ہیں جن میں ماتحت عدالتوں نے ملزم کو سزائے موت یا عمر قید کی سزا سنائی اور اعلیٰ عدلیہ نے ملزموں کو ان الزامات سے بری کر دیا۔

دفعہ 182 کے تحت کارروائی کیسے عمل میں لائی جاتی ہے؟

قانون میں اس شق کی تشریح کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سرکاری ملازم کو کسی کے خلاف کوئی معلومات دے اور وہ سرکاری ملازم اس شخص کے خلاف اپنے اختیارات استعمال کرے اور بعدازاں یہ اطلاع جھوٹی ثابت ہو تو اس شکایت کرنے والے کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

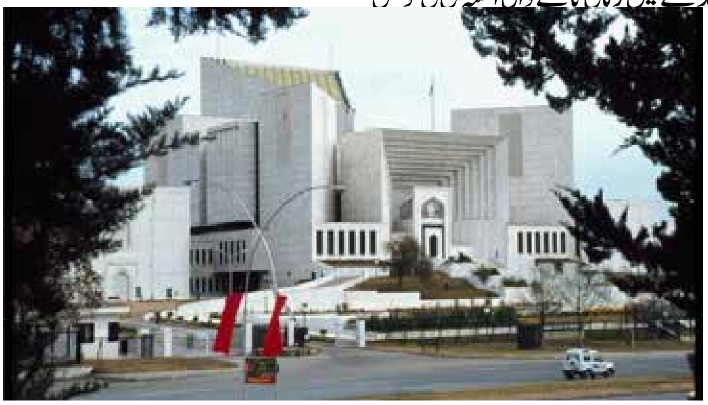

ضابطہ فوجداری کی دفعہ 154 کے تحت پولیس مقدمے کا اندراج کرنے کی پابند ہے اور مقدمے کے اندراج کے بعد پولیس تفتیش کرنے کی پابند ہے۔

اگر پولیس کسی وجہ سے کسی شخص کی درخواست پر مقدمہ درج نہ کرے تو ضابطہ فوجداری کی دفعہ 22 اے کے تحت عدالت میں درخواست دائر کی جاسکتی ہے اور عدالتی حکم پر پولیس مقدمہ درج کرنے کی پابند ہے۔

مقدمہ درج ہونے کے بعد ملزم کے خلاف تفتیش کا عمل شروع کیا جاتا ہے اور تفتیش کے بعد مقدمہ عدالتوں میں زیرسماعت ہوتا ہے۔ اگر عدالت ملزم کو بری کر دیتی ہے اور ملزم پر لگائے گئے الزامات جھوٹے ثابت ہوتے ہیں تو قانون کے مطابق اس مقدمے کا تفتیشی پولیس افسر مدعی مقدمہ کے خلاف کارروائی کے لیے ایک قلندرہ بنا کر علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں بھجوا دیتا ہے۔

علاقہ مجسٹریٹ اس بارے میں شکایت کنندہ کو نوٹس جاری کرتا ہے اور بعدازاں فرد جرم عائد ہونے کے بعد اُنھیں اس سزا سنائی جاتی ہے۔ دفعہ 30 کے مجسٹریٹ کے پاس زیادہ سے زیادہ تین ماہ کی سزا دینے کا اختیار ہے۔

قانون میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ایسا مقدمہ جس میں کسی ملزم کو مقامی عدالت نے موت کی سزا سنائی ہو یا سزا ہوسکتی ہو اور مقامی عدالت یا اعلیٰ عدالتوں نے اُنھیں ان الزامات سے بری کر دیا ہو تو ایسے مقدمے کے مدعی کو سات سال قید کی سزا ہے جبکہ ایسا مقدمہ جس میں کسی شخص کو عمر قید کی سزا سنائی گئی ہو یا ہوسکتی ہو تو ایسے مدعیِ مقدمہ کو پانچ سال کے لیے جیل جانا ہوگا۔

ضابطہ فوجداری میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کسی بھی درخواست پر تفتیش کرنے کے بعد مقدمہ درج کیا گیا ہو تو پھر ضابطہ فوجداری کی دفعہ 182 کا اطلاق نہیں ہوگا۔

قانون کے مطابق یہ ایک قابل ضمانت جرم ہے جبکہ قابل راضی نامہ نہیں ہے۔

کیا قانون میں ملزم کی داد رسی کا اور بھی کوئی طریقہ ہے؟

فوجداری مقدمات کی پیروی کرنے والے افتخار شیروانی کا کہنا ہے کہ کسی بھی مقدمے اور بالخصوص توہین مذہب کے جھوٹے مقدمات کے خلاف کارروائی ضابطہ فوجداری کی دفعہ 194 کے تحت بھی عمل میں لائی جاتی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ سزا 7 سال ہے۔

اُنھوں نے کہا کہ اگر علاقہ مجسٹریٹ پولیس کی جانب سے بھیجے گئے قلندرے پر کارروائی کرے تو وہ شخص جس نے جھوٹا مقدمہ درج کروایا ہو وہ اس مجسٹریٹ کے دائرہ اختیار کو چیلنج کر دیتا ہے اور اس طرح یہ معاملہ لٹک جاتا ہے۔

اُنھوں نے کہا کہ اگر توہین مذہب کے مقدمے میں کوئی شخص سالہا سال جیل میں رہتا ہے اور پھر اعلیٰ عدالتوں سے بری ہو جاتا ہے تو پاکستان کے قانون میں اس کے مداوے کے لیے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 182 کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

افتخار شیروانی کا کہنا تھا کہ اگر کسی شخص پر لگایا گیا الزام جھوٹا ثابت ہو جائے اور پانچ، دس سال اسی مقدمے میں جیل میں بھی گزار کر آئے تو اس کے مداوے کے لیے ریاست کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

اُنھوں نے کہا کہ ایسا شخص اپنے مداوے کے لیے جھوٹی ایف آئی آر درج کروانے والے شخص کے خلاف سول عدالت میں ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر سکتا ہے اور ایسے مقدمات پر فیصلے آنے میں دہائیاں لگ جاتی ہیں۔

پنجاب پولیس کے سابق ایس پی چوہدری سلمان کا کہنا ہے کہ عمومی طور پر تفتیشی افسران ایسے مقدمات میں جن میں الزام ثابت نہ سکا ہو مدعی مقدمہ کے خلاف علاقہ مجسٹریٹ کو قلندرہ نہیں بھجواتے۔ نہ ہی الزام بھگتنے والے اس بارے میں تفتیشی افسر کو کہتے ہیں چونکہ ان کے خلاف لگائے گئے الزامات جھوٹے ثابت ہوئے ہیں اس لیے مدعی مقدمہ کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے۔

اُنھوں نے کہا کہ تفتیشی افسر کے علاوہ پولیس افسران بھی اس جانب توجہ نہیں دیتے کہ جھوٹے مقدمات کے اندراج کے رجحان کو روکنا چاہیے۔

اسلام آباد پولیس کے تفتیشی افسر توقیر حسین کے مطابق ایک تفتیشی افسر کے پاس 40، 50 مقدمات کی تفتیش ہوتی ہے تو ایسے حالات میں وہ بمشکل مقدمے کے فیصلے سے آگاہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس اتنا وقت ہوتا کہ قلندرہ بھجوایا جائے۔

اُنھوں نے کہا کہ قلندرہ بھجوانے کے لیے متعلقہ عدالت کی طرف سے بھی اس ضمن میں نوٹس نہیں بھجوایا جاتا۔

اُنھوں نے کہا کہ ایک مقدمے کا فیصلہ آنے میں کم از کم چار سے پانچ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے اور اس عرصے میں تفتیشی افسران کی ان تھانوں سے ٹرانسفر بھی ہو چکی ہوتی ہیں جہاں پر اُنھوں نے مقدمہ درج کیا تھا۔

اسلام آباد پولیس کی حالیہ تاریخ میں صرف ایک ایسا مقدمہ ہے جس میں مدعی مقدمہ کے خلاف کارروائی عمل میں لائی گئی ہے اور وہ مقدمہ کمسن مسیحی خاتون رمشا مسیح کے خلاف توہین مذہب کا مقدمہ تھا۔

سابق حکمراں جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے دور میں رمشا مسیح پر توہین مذہب کا مقدمہ اسلام آباد کی ایک مقامی مسجد کے خطیب حافظ محمد خالد نے اگست 2012 میں درج کروایا تھا تاہم رمشا مسیح کے کمسن ہونے اور شواہد نہ ہونے کی بنا پر اسے تو بری کر دیا گیا۔ مقامی پولیس نے ڈپٹی کمشنر کی ہدایت پر مدعی مقدمہ کے خلاف قانونی کارروائی کرتے ہوئے اسے تین ماہ کے لیے جیل بھیج دیا۔

عمومی طور پر توہین مذہب کا مقدمہ ڈپٹی کمشنر کی مدعیت میں درج کروایا جاتا ہے لیکن پاکستان میں ایسے مقدمات کی تعداد زیادہ ہے جس کا مدعی کوئی سرکاری افسر نہیں بلکہ کوئی عام شخص ہے۔

ماہر قانون الیاس صدیقی کہتے ہیں کہ جھوٹے مقدمات کی حوصلہ شکنی کے لیے بنائے گئے قانون کے غیر موثر ہونے کی وجہ سے لوگوں کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر جائیدادوں میں قبضہ کرنے کے واقعات میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔

اُنھوں نے کہا کہ راولپنڈی میں ایک مقامی مسجد کے امام نے ایک شخص پر توہین مذہب کا مقدمہ درج کروایا جو آج بھی اڈیالہ جیل میں قید ہے جبکہ اس کے گھر والے خوف کے مارے بیرون ملک چلے گئے اور اس کی غیر موجودگی میں اس کی کروڑوں روپے کی جائیداد پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔

اُنھوں نے کہا کہ اسلام آباد میں جتنی بھی پرائیویٹ ہاؤسنگ سوسائٹیاں ہیں ان میں بہت سے رقبے مخالفین کو پولیس کی مدد سے جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر جائیدادوں پر قبضہ کر کے حاصل کیے جاتے ہیں اور پھر جھوٹے مقدمے کی آڑ میں ملزموں کے ساتھ معاملات طے کر کے زمین اونے پونے داموں خرید لی جاتی ہے۔

جھوٹے مقدمہ پر سزا دینے والے جج کے خلاف کارروائی ممکن ہے؟

لاہور ہائی کورٹ کے سابق جج شاہ خاور کا کہنا ہے کہ ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس میں ماتحت عدلیہ کے کسی جج کے خلاف اس کے فیصلے سے متعلق اس کا مواخذہ کیا جائے۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر ماتحت عدلیہ کا کوئی جج کسی مقدمے میں غلط فیصلہ کرتا ہے تو ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ اس فیصلے کو کالعدم قرار دینے کی مجاز ہیں۔

اُنھوں نے کہا کہ کسی بھی ماتحت عدلیہ کے جج کو غلط فیصلہ دینے کی بنا پر اس کے عہدے سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔

شاہ خاور نے سلمان تاثیر قتل کے مقدمے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اسلام آباد ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس شوکت عزیز صدیقی نے مجرم ممتاز قادری کے خلاف درج مقدمے میں انسداد دہشت گردی کی دفعات کو ختم کر دیا تھا تاہم سپریم کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس آصف سعید کھوسہ نے اپنے ریمارکس میں عدالت کے اس فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا اور ممتاز قادری کے خلاف مقدمے میں انسداد دہشت گردی کی دفعات کو برقرار رکھا تھا لیکن جسٹس شوکت صدیقی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں گئی تھی۔

شعبہ پاکستان

ایک تھا بڑا آدمی!

تحریر: عطاء الحق قاسمی

قیامت کی طرح بڑے آدمیوں کی بھی کچھ نشانیاں ہوتی ہیں مثلاً بڑا آدمی بڑے لوگوں میں اٹھتا، بیٹھتا اور لیٹتا ہے۔ وہ تقریبات میں صفِ اوّل کی نشستوں پر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے، بڑا آدمی جب اپنے رفقاء کے ساتھ کسی اعلیٰ درجے کے ریستوران میں داخل ہوتا ہے تو بیرے اسے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ وہ بیروں کو ان کے نام سے پکارتا ہے جس سے اس کے رفقاء کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے روز وشب یہیں بسر ہوتے ہیں۔ سلام کے لئے بیرے کو ایک بار بھاری ٹپ اور انہیں نام سے پکارنے کے لئے اچھا حافظہ مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بڑا آدمی سگریٹ نہیں پائپ پیتا ہے۔ وہ پائپ پیتا کم ہے اسے جلاتا، بجھاتا زیادہ ہے اور گفتگو کے دوران اس کا بیشتر وقت انہی سرگرمیوں میں بسر ہوتا ہے۔ بڑے آدمی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ ہر جملے کا آغاز انگریزی میں کرتا ہے اور لہجے کو حسبِ توفیق ''آکسن'' بنانے کی کوشش کرتا ہے تاہم واضح رہے کہ انگریزی زبان کے قواعد وضوابط سے بڑے آدمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

بڑا آدمی ہمیشہ بڑے گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے تمام عزیز واقارب کلیدی اسامیوں پر فائز ہوتے ہیں۔ یہ عزیز واقارب اس نے بڑی محنت سے اپنے شجرہ نسب میں شامل کئے ہوتے ہیں۔ بڑا آدمی کبھی کم گو اور کبھی پُرگو نظر آتا ہے تاہم اس امر کا فیصلہ اسے خود کرنا ہوتا ہے کہ اسے کس سے تھوڑی اور کس سے زیادہ بات کرنی ہے۔ بڑے آدمی کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ کا سرپرست ہوتا ہے، مصوری سے شعر وادب تک اس کی چراگاہیں ہیں۔ وہ اپنے کمرے کی کلر اسکیم سے میچ کرتی ہوئی سرورق والی کتابیں خریدتا ہے اور ایک شیلف میں سجاتا ہے۔ وہ تجریدی مصوری سے بھی اپنے گہرے شغف کا اظہار کرتا ہے اور ثبوت کے لئے ایک آدھ تصویر ڈرائنگ روم میں بھی 'ٹانگ' دیتا ہے۔ وہ تصویر کے ساتھ مصور کو بھی 'ٹانگنا' چاہتا ہے مگر کچھ مجبوریاں آڑے آتی ہیں۔

بڑا آدمی بیٹھے، بٹھائے بڑا آدمی نہیں بن جاتا، اس کے لئے اسے شدید محنت کرنا پڑتی ہے۔ وہ صبح سے لے کر شام تک کام اور شام سے رات گئے تک پارٹیاں کرتا ہے۔ صبح سے شام تک والے کام میں بہت سے کام شامل ہوتے ہیں اور شام سے رات گئے جاری رہنے والی پارٹیوں میں بہت سی ''پارٹیاں'' شریک ہوتی ہیں۔ اس کی عظمت کی ایک وجہ اس کا منکسر المزاج ہونا بھی ہے۔ وہ کبھی اپنے مال و دولت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا بلکہ ہمیشہ انکسار سے کام لیتے ہوئے بینک سے حاصل شدہ قرضوں کا ذکر کر کے خود کو کروڑوں روپے کا مقروض ظاہر کرتا ہے، کئی بار تو یہ حکایت بیان کرتے وقت اس پر اتنی رقت طاری ہوجاتی ہے کہ بائیں ہاتھ کو بے خبر رکھتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اس کی جیب میں ایک سو کا نوٹ ڈالنے کو جی چاہتا ہے کہ آج کی شب اس کے گھر میں چولہا جل سکے۔ اس کے بڑا آدمی بننے کے پیچھے ایک عمل یہ بھی کارفرما ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرتبے اور مقام کو بھول کر سب سے خصوصاً انکم ٹیکس، ایکسائز اور آڈٹ والوں سے احسان ومحبت کا سلوک کرتا ہے۔ بڑے آدمی کو بڑا آدمی یونہی تسلیم نہیں کرلیا جاتا۔ اس کی پیٹھ پر فلاحی اداروں کے لئے خیراتی رقوم کا بوجھ ہوتا ہے جسے وہ اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے لیکن وہ نہیں چاہتا کہ اس کی اطلاع اخبار کے رپورٹر اور فوٹو گرافر کے علاوہ کسی اور کو ہو کہ کہیں اس کی نیکیاں ضائع نہ چلی جائیں۔

بڑے آدمی کی عظمت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹے آدمیوں کو بھی ساتھ رکھتا ہے جن میں وہ بڑا آدمی دکھائی دیتا ہے۔ بڑے آدمی کی یہ تمام خوبیاں اور خصائل اس کی زندگی میں بھی اس کے کام آتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اس کی عظمت کو اجاگر کرتے ہیں چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بڑا آدمی مرتا ہے تو اگلے دن خبر آتی ہے کہ اس کے جنازے میں شہر کے تمام بڑے آدمی شریک ہوئے تاہم یہ بڑے آدمی کاروں میں قبرستان پہنچ جاتے ہیں، کندھا دینے والے چار آدمی چھوٹے آدمی ہوتے ہیں۔ چھوٹے آدمی کی یہ بڑی نشانی ہوتی ہے کہ اس کے کندھے چوڑے ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ بڑے آدمیوں کو کندھا دیتا ہے۔ افسوس بڑے آدمی بھی بالآخر اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں اور بیس بیس کنالوں والی کوٹھیوں سے نقل مکانی کر کے انہیں بقیہ عمر چھوٹے آدمیوں کے ساتھ دو دو گز والے ''پلاٹ'' کی قبروں میں بسر کرنا پڑتی ہے۔ بڑے آدمیوں کو چاہئے کہ وہ اس افسوسناک صورتحال پر غور کریں اور یہ اپنے سے بڑے آدمیوں کے نوٹس میں بھی لائیں۔

❁❁❁

شعبہ پاکستان

لاہور کا پانی 6 سال بعد ختم؟

تحریر: واصف ناگی

چیئرمین جوڈیشل واٹر کمیشن جسٹس (ر) علی اکبر قریشی نے انکشاف کیا ہے کہ ''لاہور میں زیر زمین پانی کی سطح آٹھ سوفٹ سے بھی نیچے چلی گئی ہے اور اگر یہی صورتحال رہی تو 2025ء میں لاہور میں پانی ختم ہوجائے گا، لاہور کی 700 فیکٹریاں گندا پانی بورنگ کے ذریعے زمین کے اندر ڈال رہی ہیں۔ اب تک 200 فیکٹریوں کو نوٹسز بھی جاری کئے گئے ہیں''۔

وہ لاہور جہاں کے شہری علاقوں میں ہمارے بچپن میں صرف 40 سے 45 فٹ پر پانی آجاتا تھا، آج دوسوفٹ جاکر جو پانی مل رہا ہے وہ بھی پینے کے لائق نہیں۔ اب تک ہمارے حکمرانوں اور ڈیمز کی مخالفت کرنے والوں کو پانی کے بحران کی سنگینی کا احساس نہیں ہورہا۔ عوام تو ہمارے بے چارے ناسمجھ اور حالات سے بے خبر ہیں کہ انہیں جو بھی حکومت جس طرف لگاتی ہے، اسی طرف لگ جاتے ہیں۔ لاہور کو کیا اورنج ٹرین کی ضرورت تھی یا صاف پانی اور جدید اسپتالوں کی؟

لو جی اب ایک اور خبر آگئی ہے کہ ٹھوکر سے جلوموڑ تک ٹرام چلائی جائے گی۔ 36 کلو میٹر کا ٹریک بچھایا جائے گا، اب اس پر کروڑوں روپے لگ جائیں گے، محکمہ ٹرانسپورٹ یہ منصوبہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور چین کی کسی کمپنی سے معاہدے وغیرہ کی خبر ہے۔ ارے اللہ کے بندو! لاہور میں انگریزوں کے دور کا بڑا زبردست سٹی ٹرین ٹریک موجود ہے جو شاہدرہ سے رائیونڈ اور جلوموڑ تک ہے۔ بجائے اس کے کروڑوں روپے کا گھپلا ہو اور پھر نیب افسروں کو پکڑے، اس سے بہتر ہے کہ اس ٹریک کو ٹھیک کرکے ٹرام یا ٹرین شروع کر دی جائے۔ شیخ رشید ویسے ہر ہفتے لاہور کے ریلوے ہیڈ کوارٹر میں آکر سیاسی بیان بازی تو بہت کرتے ہیں کبھی وہ ہربنس پورہ اور مغل پورہ بھی جاکر دیکھیں کہ کس طرح ریلوے بوگیاں کھڑی کھڑی تباہ ہورہی ہیں اور کس طرح ریلوے ٹریکوں پر لوگوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ خیر اس پر پھر کبھی بات کریں گے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جوڈیشل واٹر کمیشن کی واضح وارننگ کے باوجود کسی حکومتی عہدیدار یا سول سوسائٹی نے اس پر بات نہیں کی اور 2025ء میں سال ہی کتنے رہ گئے ہیں؟ ذرا دیر کو سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کی سنگینی کے بارے میں سوچیں۔ جب لاہور میں پینے کے لئے، نہانے کے لئے، کاشت کے لئے پانی نہیں ملے گا، تو پھر کیا ہوگا؟

اگلے روز ہم اور پروفیسر ممتاز حسن پاکستان کی ایک انتہائی اہم شخصیت کے ساتھ ایک نشست میں پانی کے مسئلے پر بات کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں اگر ڈیم نہ بنے تو پورا ملک بنجر ہوجائے گا، فصلوں کے لئے پانی نہیں ملے گا، لوگ پینے اور نہانے کے لئے پانی کو ترسیں گے اور لوگوں کے ذہن میں یہ بات کہ ڈیمز کے لئے جو پیسے اکٹھے کئے گئے ہیں وہ آج کہاں ہیں؟ تو اس سلسلے میں عوام کو بالکل مطمئن رہنا چاہئے کہ ان کے دیئے گئے عطیات کی رقوم بالکل محفوظ ہیں اور اس وقت اُس پر کام شروع ہوچکا ہے۔ اگلے روز ایک اہم شخصیت ذکر کر رہی تھی کہ زرداری کے ایک فرنٹ مین کے بیٹے کو جب جیل میں رکھا گیا تو اس کی طبیعت پانی پینے سے خراب ہوگئی حالانکہ جیل حکام اس کو منرل واٹر دیتے رہے۔ پتا چلا کہ موصوف کے گھر میں جو پانی استعمال ہوتا ہے وہ فرانس سے آتا ہے۔ پانی فروخت کرنے والی ایک کمپنی کے مالکان تو اپنی کمپنی کا پانی بھی نہیں پیتے بلکہ ان کا پانی بھی فرانس سے آتا ہے جن لوگوں کا پانی فرانس اور ڈنمارک یا دیگر ممالک سے آئے گا ان کو کیا پتا کہ اس ملک میں کیا ہونے والا ہے؟ کسی زمانے میں لاہور اور پاکستان کے کئی شہروں کا پانی اس قدر صاف اور جراثیم سے پاک تھا کہ لوگ کارپوریشن کے نلکوں کا پانی پیا کرتے تھے۔ دنیا بھر میں سالانہ 35 لاکھ کے قریب افراد آلودہ پانی پینے سے ہلاک ہوجاتے ہیں۔ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور لندن کے نصف سے زیادہ دریا آلودگی اور امراض پھیلانے والے جراثیم سے بھر گئے ہیں۔ کبھی لاہور کے راوی کا پانی پینے کے قابل تھا اور یہاں پر دس اقسام کی مچھلی پائی جاتی تھی۔ آج راوی اور لاہور کی نہر گندا نالا بن چکی ہے۔ اس دریا اور نہر کے پانی کو آلودہ ہمارے لوگوں نے کیا ہے۔

ڈنمارک، کینیڈا، فرانس، امریکہ اور کئی ممالک میں آپ نلکوں سے آنے والا پانی پی سکتے ہیں۔ ہم نے خود ڈنمارک کے ہوٹل میں قیام کے دوران واش روم میں لکھا ہوا دیکھا تھا کہ آپ ٹیپ واٹر پی سکتے ہیں۔ اس ملک میں جو لوگ ڈیمز کی مخالفت کر رہے ہیں وہ ملک دشمن ہیں اور اس ملک کو بنجر، ویران اور بے آباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

جس ملک میں پانی فروخت کرنے والی کمپنیوں کے مالکان نے غریب عوام کی زمین سے مفت پانی حاصل کرکے اربوں روپے کمائے، کیا آج وہ کسی کو جوابدہ نہیں۔ اللہ بھلا کرے سابق چیف جسٹس آف پاکستان میاں ثاقب نثار کا، جنہوں نے پانی فروخت کرنے والی کمپنیوں کے خلاف ایکشن لیا اور عوام میں پانی کی قلت کے بارے میں شعور و آگاہی پیدا کی۔ آج پھر پانی فروخت کرنے والی کمپنیاں من مانیاں کر رہی ہیں۔ اگر عوام ان مالکان کے گھروں میں استعمال ہونے والا پانی اور خوراک ایک بار دیکھ لیں تو یقین کریں، حیرت سے مرجائیں گے۔ باہر کے ممالک کا پانی، باہر کے ممالک سے سبزیاں اور گوشت تک منگوایا جاتا ہے مگر موت پھر بھی آجائے گی اور بیماریاں پھر بھی لگ جائیں گی۔

زندگی سے اتنا پیار نہ کر
چلے تجھ کو بھی جانا ہے زمین کے اندر

تختِ لاہور کا "لاہوری انصاف"

تحریر: ابن قدسیؔ

پانی اپنا راستہ خود بناتا ہے۔اپنے دباؤ کے تحت جس طرف اسے راستہ ملتا ہے وہ ادھر ہی چلا جاتا ہے۔اگر اس کی مقدار کم ہو تو پھر بھی نقصان دیتا ہے لیکن اگر زیادہ ہو تو پھر وہ اپنا راستہ بناتے ہوئے تباہی مچا دیتا ہے۔اس لیے اس کو قابو میں رکھنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے مخصوص راستہ دینا ضروری ہے ورنہ اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔جب پانی کی مرضی چلتی ہے تو صرف اس کی چلتی ہے۔باقی سب اس کے ساتھ چلتے ہیں۔

قانون بھی اپنا راستہ خود بناتا ہے۔پاکستان میں رہتے ہوئے اس جملہ کو سمجھنا بہت آسان ہے کیونکہ یہاں بھی قانون "امیر" کے لیے اپنا راستہ خود بناتا چلا جاتا ہے۔اور یہ اپنا سفر اس وقت جاری رکھتا ہے جب تک "امیر" کو اس کی مرضی کا "انصاف" نہیں مل جاتا ہے۔جس طرح پانی سے فائدہ اٹھانا کے لیے خرچ کرنا پڑتا ہے اور اپنی مرضی کا راستہ بنا کر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔اسی طرح "قانون" کے لیے راستہ پیسے کے ذریعہ بن جاتا ہے۔

پاکستان میں اس وقت انصاف فراہم کرنے والی عدالتوں میں بڑے ہائی پروفائل کیسز چل رہے ہیں۔لیکن بس چل ہی رہے ہیں اور پوری قوم اس پتلی تماشے کو دیکھ رہی ہے۔پتلی تماشے میں تو پھر بھی کوئی فائدہ ہوتا ہے تھوڑی دیر کے لیے دل بہل جاتی ہے۔کچھ ذہنی آسودگی میسر آجاتی ہے۔لیکن اس عدالتی "پتلی تماشے" سے تو سوائے ذہنی کوفت کے اور کچھ نہیں ہو رہا۔عدالت اور اس کے بعد جیل تک ہمارا ہر سیاسی لیڈر اس قدر بیمار ہو جاتا ہے کہ اسے فوراً انسانی ہمدردی کے تحت ہسپتال یا گھر منتقل کر دیا جاتا ہے۔ویسے ان سیاسی قائدین کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہیے جو ہزار ہا پیچیدہ بیماریوں کے باوجود قوم کی "خدمت" میں لگے رہتے ہیں۔اگر یہ قانون ،عدالت یا جیل نہ ہوتی تو شاید یہ راز راز ہی رہتا۔کہ کس "جانفشانی" کے ساتھ سیاسی قائدین "ملکی سلامتی" کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔وہ تو جب کوئی ریفرنس بنتا ہے۔ریمانڈ ملتا ہے، تفتیش شروع ہوتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ موصوف کو تو کئی جان لیوا بیماریاں ہیں۔آفرین ہے ہمارے قومی "درد" رکھنے والے عمائدین پر۔اگر کہیں کوئی عدالت سزا دینے کی جرات کر لے تو پھر ایسی بیماریاں سر نکال لیتی ہیں جن کی تشخیص ہمارے ملک میں ہو ہی نہیں سکتی۔اس کے لیے صرف لندن ہے ۔

شریف خاندان گزشتہ تیس سال سے کسی نہ کسی رنگ میں پاکستان پر حکمرانی کر رہا ہے۔پنجاب تو ویسے ہی ان کے زیر نگیں رہا۔تختِ لاہور ان کا گڑھ ۔لاہور کے بارے میں ہی ان کا دعویٰ ہے کہ یہ پیرس ہے۔ایک پوری نسل ان کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔نہ شریف خاندان کا خیال تھا کوئی ان کی جگہ آسکتا ہے اور نہ کسی اور کا خیال تھا کہ ان پر زوال آئے گا۔اس لیے ان تیس سالوں میں آج تک کسی نے ان سے حساب نہیں مانگا۔کیا عدالتیں کیا نیب۔کسی کی مجال نہیں تھی۔اب ان پر مختلف کیسز بنے کئی ریفرنس دائر ہوئے۔شاید مزید بھی ہوں۔حساب مانگا گیا تو کہا کہ سب کچھ ہے۔سب "ذرائع" بتائے لیکن احتساب عدالت نے نواز شریف کو العزیزیہ کیس میں سزا سنائی۔دونوں بیٹے اشتہاری ہیں اگر وہ بھی پاکستان آجاتے اور عدالت کا سامنا کرتے تو شاید وہ بھی سزا یافتہ ہوتے۔وہ بیرون ملک ہیں اور ان کی واپسی فی الحال نہیں۔

اب نواز شریف ایک سزا یافتہ مجرم ہیں۔جس کا انہوں نے ساری زندگی سوچا بھی نہیں ہوگا۔کیونکہ عدالتوں سے انہیں ہمیشہ فوری اور بروقت "انصاف" مل جاتا ہے۔چھٹی والا دن ہی کیوں نہ ہو۔عدالت لگتی ہے۔بینچ بنتا ہے۔جج بیٹھے ہیں۔متعلقہ اداروں کی فوری طلبی ہوتی ہے۔وکلاء کا کام بھی جج سنبھال لیتے ہیں۔ڈرافٹ تک خود تیار کرتے ہیں۔تمام قانونی تقاضے پورے کیے جاتے ہیں اور شریف خاندان کو فوری اور جلد تر "انصاف" مہیا کیا جاتا ہے۔خاص طور پر لاہور ہائی کورٹ نے تو تمام تر عدالتی تیزیوں کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ایک دن میں کئی کئی سماعتیں کر کے آدھے آدھے گھنٹے کا وقفہ دے کر جس تیزی سے فیصلہ صادر کرتے ہیں۔اس سے عدالتوں پر عوام کا "اعتماد" بہت بڑھ گیا ہے۔ایسے ہی عدالتوں کا نام بدنام کیا ہوا ہے کہ عدالت میں جو معاملہ جاتا ہے وہ کئی نسلوں تک چلتا ہے۔دادا نے کیس دائر کیا ہے تو پوتا ہی فیصلہ سن سکتا ہے۔یہ سب غلط ثابت ہو گیا ہے۔کیونکہ اب شریف خاندان کے تیس سالہ دور حکومت کے بعد تختِ لاہور کی عدالتوں کی "رفتار" اس قدر تیز ہے کہ شاید پوری دنیا سے قانونی ماہرین لاہور ہائی کورٹ سے ٹریننگ کے لیے اپلائی کریں گے کہ ان کو بھی اس طرح ٹریننگ دیں تاکہ وہ بھی اس رفتار سے کام کر سکیں۔

ساری دنیا اگر یہ ٹریننگ حاصل کر لے تو پھر بھی ہائی کورٹ کا "اعزاز" قائم رہے گا۔ساری دنیا اس تیز رفتاری سے عدالتی کارروائی کر بھی لے لیکن ان کے پاس شریف خاندان نہیں ہوگا۔وہ عدالتیں جلدی انصاف مہیا کریں گی تو وہ انصاف ہوگا

۔اور ہر ایک کے لیے ہو گا۔اس طرح تو ہر انصاف پسند عدالت کر لیتی ہے ۔اس طرح کا کام تو سارے کر لیتے ہیں۔لیکن ہائی کورٹ لاہور کا انصاف ہی ''لاہوری انصاف '' ہے جو دنیا میں کوئی اور نہیں دے سکتا ہے ۔

نواز شریف کو سزا ہوئی تو ن لیگ کی طرف سے مسلسل ضمانت کی کوشش ہو رہی تھیں یہ زا معطلی کی کوشش، ججوں کو خریدنے،دباو ڈالنے سے لے کر میڈیا وار کو عروج تک پہنچایا ,حکومت کسی طور سے بھی ریلیف دینے کو تیار نہیں ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کی امید تھی۔ ہماری ''معصوم عوام'' کو معلوم ہوا کہ ان کا ''محبوب لیڈر'' تو کوئی جان لیوا بیماریوں میں مبتلا ہے اور اگر ان کو لندن کی ہوا نہ لگی تو مر جائیں گے ۔ بھر پور کوشش کے باوجود حکومت غیر مشروط طور پر لندن بھجوانے پر تیار نہیں ہوئی ۔7ارب کے بانڈز جمع کروانے کے بعد انسانی ہمدردی کے تحت جانے کی مشروط اجازت دی گئی۔ بات تین سو ارب سے شروع ہوئی اور سات ارب تک پہنچی۔شریف خاندان یہ سات ارب بھی بطور ضمانت جمع کروانے کے لیے تیار نہیں ہوا بلکہ غیر مشروط طور پر جانے کی ضد کی۔حکومت کے موقف میں لچک نہ دیکھتے ہوئے شریف خاندان نے آخر کار لاہور ہائی کورٹ سے''لاہوری انصاف'' کے لیے رجوع کیا۔

نواز شریف کو اسلام آباد ہائی کورٹ سے علاج کے لیے آٹھ ہفتوں کی ضمانت ملی ہوئی تھی اس لیے اب مزید کوئی کارووائی لاہور ہائی کورٹ میں نہیں ہو سکتی تھی۔اس لیے حکومت کی طرف سے یہ اعتراض اٹھایا گیا کہ لاہور ہائی کورٹ میں شریف خاندان کی درخواست قابل سماعت نہیں۔لیکن وہ شریف خاندان تھا جس کو کم از کم ''لاہوری انصاب'' جلد اور لازمی ملتا ہے۔اس لیے لاہور ہائی کورٹ نے نہ صرف یہ فیصلہ کیا کہ درخواست قابل سماعت ہے بلکہ سوموار کی بجائے ایک دن بعد یعنی ہفتہ کے روز کو ہی سماعت کے لیے مقرر کر لیا۔ ہفتہ کو عام طور پر کسی کیس کی سماعت نہیں ہوتی لیکن یہ شریف خاندان تھا جس کے لیے ''لاہوری انصاف'' ہر وقت حاضر باش ۔ایک ہی دن میں کل سات گھنٹوں کے اندر چار ساعتوں میں دو بیان حلفی لے کر نواز شریف کو لاہور ہائی کورٹ سے ''لاہوری انصاف'' مل ہی گیا۔ سات ارب کے بانڈز بھی ختم۔ایک ملزم نے مجرم کے بارے میں بیان حلفی جمع کروایا اور لندن جانے کی اجازت۔اس ملزم نے مجرم کے ساتھ روانگی کے اعلان کے ساتھ مٹھائیاں تقسیم کروائیں۔مجرم تو سزا یافتہ اور عدالت کے مطابق کرپٹ تھا ہی اور اس کی ضمانت دینے والے ملزم بھی کرپشن کے الزامات کی زد میں ہے۔ پھر بھی دنوں ملزم اور مجرم اپنے اپنے بیان حلفی جمع کروا کر ''لاہوری انصاف'' لے کر روانہ۔

شاید کبھی عوام کے لیے کوئی عدالت اتنی جلدی انصاف مہیا کرے۔شاید کبھی کوئی ان تیس سالہ دور اقتدار رکھنے والے خاندان سے پوچھ سکے کہ انہوں نے اس ملک میں کوئی ایسا ہسپتال کوئی نہیں بنایا جہاں کم از کم ان کا ہی علاج ہو سکے۔شاید کوئی ان مجرموں کے بارے میں بھی سوچے جو اس وقت بھی جیلوں میں بند پڑے ہیں اور وہ شدید بیمار ہیں۔شاید کوئی ان حکمرانوں کی گردن پکڑے جنہوں نے ہسپتال نہیں بنائے اور کتنے ہی بیمار بیماریوں کی وجہ سے بیمار مر گئے۔شاید کوئی عام عوام کو لندن کے ویزے جاری کروائے تا کہ وہ بھی ان ہسپتالوں میں علاج کرو اسکیں جہاں صرف حکمرانوں کا علاج ہوتا ہے۔

شاید کبھی کوئی عوام کے بارے میں سوچنے والا بھی آئے۔

❀❀❀

قارئین کے لئے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور نے قارئین کے لئے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں،مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے ''ادارہ'' پُرعزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدر دانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد ''ہفتہ وار'' کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

وراثت بسلسلہ میں تے منو بھائی

تحریر: منو بھائی

ایک ریسرچ کے مطابق دنیا بھر میں ایک لاکھ قسم کے مختلف جسمانی امراض بنی نوع آدم کی نسل کو مٹا رہے ہیں۔ بیماریاں جراثیم کے ذریعے پھیلتی ہیں اور جراثیم سے بچنے کا حکم ہمارے دین کے ذریعے بھی ہمیں ملا اور صفائی کو نصف ایمان کا درجہ دیا گیا۔ گویا کسی کا چھپا ہوا نصف ایمان دیکھنا ہو تو اس کے ماحول میں صفائی کے معیار کو دیکھ لیا جائے۔ گندگی میں پھیلنے والے بہت سے جراثیم فضا میں سفر کرتے ہیں اور سانس کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہو جاتے ہیں جبکہ کچھ جراثیم بذریعہ خوراک جسمانی نظام کو متاثر کرتے ہیں۔ انسانوں کا طرز زندگی بھی بہت سی بیماریوں کو جنم دیتا ہے، کئی امراض بڑھتی ہوئی عمر میں انسان کو پکڑ لیتے ہیں اور کچھ امراض ایسے بھی ہیں جن کا تعلق والدین سے ہوتا ہے اور وہ پچھلی نسل سے اگلی نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ریسرچ یہ بھی بتاتی ہے کہ پاکستان میں 10 نوعیت کے امراض انتہائی خطرناک ہیں۔ پاکستان میں پائی جانے والی زیادہ تر بیماریوں کا تعلق سانس کی نالی سے ہے۔ ان بیماریوں میں نمونیہ اور نزلہ زیادہ عام ہیں۔ دیہی علاقوں میں ملیریا غریب طبقے کا دشمن ہے۔ پسماندہ اور نواحی بستیوں میں بھی ملیریے کے کیسز زیادہ ہیں۔ ناقص سینٹری سسٹم اور سیوریج کے باعث پیدا ہونے والے مچھروں اور مکھیوں کے ذریعے سے یہ بیماری پھیل رہی ہے۔

پاکستان میں ہیپاٹائٹس بی اور سی کے مریضوں کی تعداد 1 کروڑ 20 لاکھ کے قریب ہے۔ چھوٹی آنت کی ایک بیماری ہیضہ ہے۔ قابل علاج ہونے کے باوجود یہ پاکستان میں لاعلاج ہے۔ برسات میں اس کے جراثیم زیادہ شدت سے پھیلتے ہیں۔ ڈینگی بخار قابل علاج ہونے کے باوجود انسان کے قابو سے باہر ہے۔ ٹی بی کا شمار بھی موذی بیماریوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں ٹی بی کے امراض کی تعداد زیادہ ہے۔ پاکستان میں چھاتی کا سرطان ایک عام بیماری ہے۔ ہر 9 ویں عورت اس میں مبتلا ہے جبکہ ہر سال 40 ہزار خواتین اس مرض میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں دل کے امراض سے ہونے والی شرح اموات دو لاکھ سالانہ سے تجاوز کر چکی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں بڑھتا ہوا موٹاپا اور ذیابیطس دل کے امراض کا سبب بن رہا ہے۔ پاکستان میں ذیابیطس میں مبتلا افراد کی تعداد 70 لاکھ ہے اور یہ تناسب جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ ہے۔ پھیپھڑوں کے سرطان سے 1 لاکھ افراد ہر سال مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے مطابق 90 فیصد مریضوں میں اس مرض کی وجہ سگریٹ نوشی ہے۔ والدین سے بچوں میں منتقل ہونے والی بیماریوں میں سب سے مہلک تکلیف دہ اور دردناک بیماری تھیلے سیمیا اور ہیموفیلیا ہیں۔ بیشمار غریب لوگ ان بیماریوں کا علاج سوچ ہی نہیں سکتے، اس لئے بہت سے ادارے اس کوشش میں مصروف ہیں اور میری دعا ہے کہ ان سب اداروں کو کامیابی نصیب ہو اور یہ بیماریاں، ہمارے ملک سے اس طرح چلی جائیں، جس طرح وہ دنیا کے ترقی پذیر ملکوں سے غائب ہو چکی ہیں۔ ہم ایک صاف ستھرا اور بیماریوں سے پاک پاکستان دیکھ سکیں۔ یہ تو میرے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے تھیلے سیمیا اور ہیموفیلیا کی بیماریوں میں مبتلا بچوں کے لئے اپنی زندگی کا باقی ماندہ حصہ وقف کر رکھا ہے یہ جو میری موت تک چلے گا، لیکن میں یہاں اپنی اس خواہش کو بھی پڑھنے والوں تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ جس طرح امراض کے جراثیم پچھلی نسل سے اگلی نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ میرے اس مقصد میں بھی میری اگلی نسل شامل ہو جائے اور میرے گھرانے کے افراد میرے بچوں، بھانجوں، بھانجیوں، بھتیجوں اور بھتیجیوں میں سے بھی کچھ لوگ ان موذی امراض کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں اور میری اس وراثت کے حصے دار بنیں جو انسانیت کی اصل معراج ہے۔

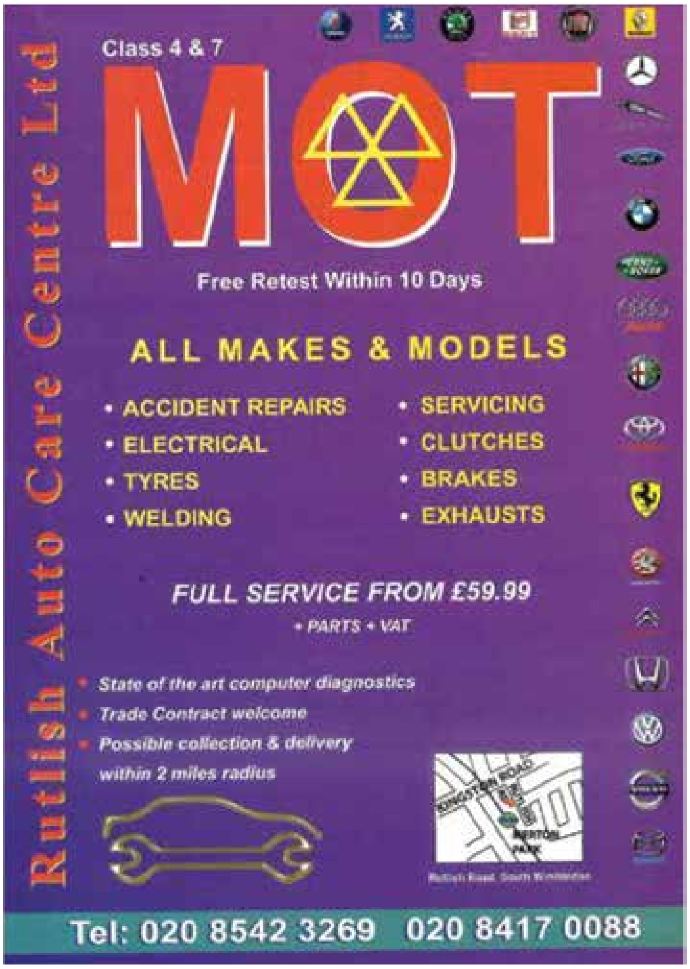

صدقے جاواں مولانا

تحریر: جاوید چوہدری

آپ کو 2014 اچھی طرح یاد ہو گا‘ عمران خان نے اپنے کزن علامہ طاہر القادری کے ساتھ وزیراعظم میاں نواز شریف کو گریبان سے پکڑ کر اقتدار کی کرسی سے اتارنے‘ وزیراعظم کا استعفیٰ لینے اور نیا پاکستان بنانے کے لیے اسلام آباد پر دھاوا بول دیا تھا‘ یہ ایک تاریخی مگر عین حلال یلغار تھی‘ حلال دھرنا کیل لگے ڈنڈوں‘ کٹرز‘ کرینوں اور ڈی جے بٹ سے لیس تھا‘ عمران خان نے کنٹینر پر کھڑے ہو کر بجلی کے بل بھی جلائے‘ سول نافرمانی کا اعلان بھی کیا اور عوام سے بل ادا نہ کرنے کی اپیل بھی کی‘ عمران خان کے ٹائیگر پارلیمنٹ ہاؤس کے جنگلے توڑ کر اسمبلی کے احاطے‘ ایوان صدر کا گیٹ توڑ کر ایوان صدر‘ وزیراعظم ہاؤس کی حدود پھلانگ کر وزیراعظم ہاؤس اور پی ٹی وی کی باؤنڈری کراس کر کے سرکاری ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیوز میں بھی داخل ہو گئے اور مظاہرین نے ایس ایس پی اسلام آباد کو بھی سڑک پر لٹا کر ڈنڈوں سے زخمی کر دیا‘ وہ ایک سنہری دور تھا۔

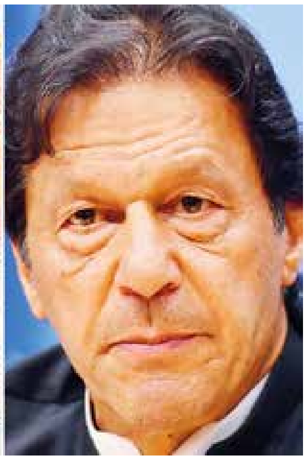

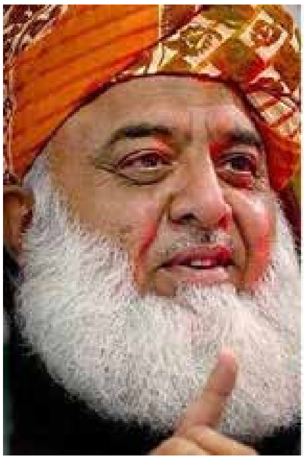

اس سنہری دور کی سنہری یادیں آج تک پورے پاکستان کی یادداشت کا حصہ ہیں‘ یہ ایک حقیقت تھی اور اب آپ دوسری حقیقت بھی ملاحظہ کیجیے‘ عمران خان کی یلغار نے میاں نواز شریف کو اچانک پارلیمنٹ اور اپوزیشن دونوں کی اہمیت یاد دلا دی‘ یہ قومی اسمبلی پہنچ گئے‘ پارلیمنٹ کا جوائنٹ سیشن تھا‘ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے چوہدری اعتزاز احسن نے تقریر کی‘ یہ ایک دھواں دھار مگر توہین آمیز تقریر تھی لیکن آپ سیاست کی مجبوریاں دیکھیے‘ میاں نواز شریف کے پاس یہ تقریر برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا‘ یہ دل پر پتھر رکھ کر وہ تقریر سنتے رہے‘ چوہدری نثار نے اچھلنے کودنے کی کوشش کی مگر ن لیگ کے وزراء نے انھیں پکڑ کر بٹھا دیا‘ میاں نواز شریف کا چہرہ غصے سے سرخ تھا لیکن یہ چپ چاپ تقریر سنتے رہے‘ چوہدری اعتزاز احسن نے تقریر میں پنجابی ماں کا ایک لطیفہ سنایا‘ لطیفہ کچھ یوں تھا‘ پنجاب کا کوئی بدمعاش بہت ضدی‘ بہت اتھرا تھا‘ وہ کسی کا احترام‘ کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ پولیس نے چھاپا مارا اور بدمعاش کو گرفتار کر لیا‘ بدمعاش کو تھانے لے جایا گیا‘ وہاں تھانے دار نے اسے لتر مارنا شروع کر دیے‘ ماں بیٹے کی محبت میں تھانے پہنچ گئی‘ ماں نے دیکھا بیٹے کو لتر پڑ رہے ہیں اور ہر لتر پر اس کے منہ سے نکل رہا ہے ”ہائے او میری ماں“ ماں نے یہ منظر دیکھا اور اونچی آواز میں کہا ”صدقے جاواں وے تھانے دار اتم نے اسے آج کم از کم ماں تو یاد کرا دی“ چوہدری اعتزاز احسن کا کہنا تھا ہم عمران خان اور اس کے دھرنے کے خلاف ہیں لیکن ہم اس کے باوجود اس کے صدقے جا رہے ہیں‘ اس نے کم از کم حکومت کو پارلیمنٹ تو یاد کرا دی‘ آج حلف لینے کے بعد پوری حکومت پہلی مرتبہ پارلیمنٹ میں بیٹھی ہے۔

چوہدری اعتزاز احسن کی تقریر توہین آمیز تھی‘ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کو 2014 میں دودھ میں مینگنیاں نہیں ڈالنی چاہیے تھیں‘ پارٹی کے اپنے لوگوں نے بے عزت کر کے حکومت کا ساتھ دینے کی حکمت عملی کو پسند نہیں کیا تھا مگر اس کے باوجود چوہدری صاحب کی بات ٹھیک تھی‘ ہماری حکومتیں صرف اس وقت پارلیمنٹ کو یاد کرتی ہیں جب ان کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں بچتا‘ ماں ہمیشہ لتروں کے درمیان ہی یاد آتی ہے‘ یہ ایک تلخ حقیقت ہے‘ ہم اگر چوہدری اعتزاز احسن کی مثال کو آج کے پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو ہمیں آج بے اختیار یہ کہنا پڑے گا ”صدقے جاواں مولانا‘ آپ نے کم از کم حکومت کا سریا تو نکال دیا“۔

یہ حکومت پاکستان کی تاریخ کی ”شان دار“ ترین حکومت ہے‘ حکومت کی پرفارمنس صفر‘ ڈیلیوری صفر‘ عقل صفر‘ قوت فیصلہ صفر اور میرٹ صفر‘ یوٹرن میں گولڈ میڈل‘ حماقتوں میں سپر اسٹار‘ زبان درازی کے امام اور کم عقلی کے پیغمبر! یہ ہے ہماری حکومت‘ یہ کمبی نیشن اگر یہاں تک رہتا تو بھی شاید قوم برداشت کر جاتی لیکن آپ ان کا تکبر‘ ان کا غرور‘ ان کی غیر سنجیدگی اور ان کی انا ملاحظہ کیجیے‘ یہ روز اٹھ کر آسمان کی طرف تھوکتے تھے‘ آپ کسی وزیر کی گفتگو سن لیں آپ کو یوں محسوس ہو گا یہ ابھی کرسی سمیت پرواز کرے گا اور سیدھا جا کر مریخ پر لینڈ کر جائے گا‘ میں 27 سال سے صحافت میں ہوں‘ میں نے آج تک کوئی حکومت اتنی ”من حیث المتکبر“ نہیں دیکھی‘ خان تو خان‘ خان کے چپڑاسیوں کی گردنوں میں بھی فولاد تھا‘ ان لوگوں نے 14 ماہ میں پورے ملک کی چولیں ہلا کر رکھ دیں مگر آپ اس کے باوجود ان کی گفتگو سنیں‘ یہ اپنی ہر حماقت کو بھی ماضی کی جھولی میں ڈال دیں گے اور سیاہ کو سفید ثابت کرنے میں بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور اگر آپ یہ گستاخی کر بیٹھیں ”جناب آپ کا سفید تھوڑا سا میلا ہے“

تو یہ آپ سے لڑ پڑیں گے‘ قوم ایک سال سے پرویز خٹک اور شفقت محمود جیسے مفکرین کی شکل کو ترس گئی تھی۔

یہ اپنے دفتر کو بھی تشریف آوری کے قابل نہیں سمجھتے تھے لیکن مولانا کے صدقے جائیں ان کی برکت سے قوم کو پوری حکومت کی زیارت بھی ہوگئی‘ قوم نے وزراء کی آوازیں بھی سن لیں اور ان کی گردنوں کے سریے بھی نکل گئے‘ یقین کریں قوم کو سریوں کے بغیر گردنیں دیکھ کر جتنی خوشی ہو رہی ہے ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے چناں چہ میں پوری قوم کی طرف سے مولانا کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں‘ صدقے جاواں مولانا آپ کی برکت سے سریے بھی غائب ہو گئے اور قوم کو پرویز خٹک‘ اسد عمر اور شفقت محمود کے منہ سے یہ سننے کا موقع بھی مل گیا لانگ مارچ اور دھرنا برا ہوتا ہے‘ یہ جمہوریت کی توہین ہوتا ہے اور یہ کوئی جمہوریت نہ ہوئی جتھے آئیں اور حکومت کو چلتا کر دیں وغیرہ وغیرہ۔

شکر ہے وزیراعظم اور ان کی کابینہ کو کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا معاہدے کتنے عظیم ہوتے ہیں اور ریڈ زون‘ وفاقی سیکرٹریٹ‘ وزیراعظم ہاؤس‘ ایوان صدر‘ پارلیمنٹ ہاؤس اور سپریم کورٹ کتنے مقدس ادارے ہیں اور ان کی طرف قدم بڑھانے کا مطلب ملک کے مقتدر اداروں کی توہین ہوتی ہے‘ صدقے جاواں مولانا آپ نے کم از کم حکومت کو ریڈ زون اور معاہدوں کی حرمت تو سمجھا دی‘ آپ نے ان کو یہ تو بتا دیا ہجوم جب حکومتوں کا محاصرہ کرتے ہیں تو ریاست کتنی کمزور‘ ملک کتنا پیچھے چلا جاتا ہے اور آپ نے عوام کو بھی یہ سمجھا دیا 2014 میں پاکستان کے ساتھ کیا کیا ہوا تھا اور یہ لوگ آج اپنے دھرنے کو حلال اور مولانا کے مارچ کو حرام قرار دے کر کس منافقت کا اظہار کر رہے ہیں۔

میں یہاں مولانا کی ایک اور خوبی کا اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں‘ ہم مولویوں کو غیر تہذیب یافتہ اور ان پڑھ سمجھتے تھے لیکن ہم نے اس آزادی مارچ میں علماء کرام‘ مدارس کے طلباء اور مذہبی طبقے کا ایک نیا روپ دیکھا‘ مولانا فضل الرحمن کا مارچ کراچی سے شروع ہوا اور یہ ساڑھے چودہ سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے اسلام آباد پہنچا‘ مولانا کے آزادی مارچ نے واقعی راستے میں کوئی پتا توڑا اور نہ ہی گملا‘ پوری قوم نے دیکھا لاہور میں میٹرو کے ٹریکس پر بھی لوگ موجود تھے اور پلوں پر بھی‘ تقریریں بھی چل رہی تھیں اور میٹرو بھی رواں دواں تھی‘ کسی بس کے سفر میں کوئی تعطل نہیں آیا‘ یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارچ ہے۔جس میں اب تک کوئی شیشہ نہیں ٹوٹا‘ کسی نے کسی سرکاری یا پرائیویٹ پراپرٹی پر حملہ نہیں کیا‘ مارچ نے کوئی سڑک بلاک نہیں کی اور کسی گاڑی کو نہیں روکا تاہم حکومت نے پورے شہر کو کنٹینرستان بنا دیا ہے‘ آپ کو اگر 2014 کا دھرنا یاد ہو تو آپ کو یہ بھی یاد ہو گا ملک کی مہذب ترین جماعتوں کے لیڈروں اور کارکنوں نے اس میں کیا کیا تھا؟ علامہ طاہر القادری اور عمران خان دونوں نے ریڈ زون کی مت مار کر رکھ دی تھی‘ خندقیں بھی کھودی گئی تھیں‘ قبریں بھی اور درخت اور پودے بھی برباد کیے گئے تھے‘ سرکاری املاک کو بھی کھل کر نقصان پہنچایا گیا تھا‘ پانی کی مین لائن تک توڑ دی گئی تھی اور بجلی براہ راست کھمبوں اور مین لائنز سے اڑا لی گئی تھی‘ 2014 کے دھرنے کو قوم نے برداشت کیا تھا جب کہ مولانا کے ضبط نے لوگوں کو حیران کر دیا‘ کاش پاکستان کی تمام تحریکیں‘ تمام مارچز اور تمام دھرنوں میں یہی اسپرٹ ہو‘ ہم سب اتنے ہی مہذب ہو جائیں مولانا کرنا کیا چاہتے ہیں؟

ہم اب اس طرف آتے ہیں‘ میرا خیال ہے مولانا ریڈ زون بھی جائیں گے اور وفاقی سیکرٹریٹ‘ وزیراعظم سیکرٹریٹ‘ وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر کا گھیراؤ بھی کریں گے اور اگر حکومت نے ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تو یہ پورا ملک جام کر دیں گے‘ حکومت کی کوشش ہے یہ خود درمیان سے نکل جائے اور یہ لڑائی مولانا اور اداروں کے درمیان شفٹ ہو جائے‘ یہ اگر ہو گیا تو یہ ملک کی بہت بڑی بدقسمتی ہو گی‘ مولانا پھر ایک استعفے تک محدود نہیں رہیں گے‘ یہ مزید استعفوں کا مطالبہ کریں گے‘ یہ نام لے لے کر خوف ناک تقریریں کریں گے اور ٹیلی ویژن چینلز یہ تقریریں دکھانے پر مجبور ہو جائیں گے‘ اللہ ہمیں اس وقت سے بچائے‘ یہ تحریک اگر درمیان میں نہ رکی اور اپوزیشن اور حکومت میز پر نہ بیٹھی تو پھر یہ سلسلہ قومی حکومت پر جا کر رکے گا یا پھر محمد میاں سومرو کی سربراہی میں نئی حکومت بنے گی اور یہ ڈیڑھ سال بعد الیکشن کرا دے گی‘ نئے پاکستان کی حکومت کو اب قسمت ہی بچا سکتی ہے‘ ٹونے اور جادو بہرحال فیل ہو چکے ہیں‘ حکومت کا ہر نیا دن اب ایکسٹینشن پر چل رہا ہے‘ یہ ایکسٹینشن کتنی دیر ان کا ساتھ دیتی ہے یہ اللہ بہتر جانتا ہے تاہم میں ایک بار پھر مولانا کو داد دینا چاہتا ہوں‘صدقے جاواں مولانا۔

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لئے مختصر دورانئے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی، .... ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ............ اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔ ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

شعبہ پاکستان

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف

تحریر: خالد مسعود خان

برسوں پرانی بات ہے، میں اپنے ایک دوست کے پاس اس کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میرا یہ دوست تب لاہور کا ڈپٹی کمشنر تھا اور یہ دفتر لوئر مال پر واقع ہے۔ باتوں ہی باتوں میں لاہور کے سنٹرل ماڈل سکول کا ذکر چل نکلا۔ کیا شاندار سکول تھا؟ کیسی درخشاں روایات تھیں اور کیسا سنہرا منظر نامہ، جب لوگ باگ اس سکول میں اپنے بچے کے داخلے کو باقاعدہ ''تحفہ'' سمجھتے تھے۔ تب کوئی بچہ سنٹرل ماڈل سکول میں داخل ہو جاتا تھا تو اس کے ماں باپ بالکل ویسی ہی خوشی محسوس کرتے تھے جیسی آج کل ماں باپ اپنے بچے کو کسی اعلیٰ رینک کی امریکی، آسٹریلین یا برطانوی یونیورسٹی میں داخلہ ملنے پر محسوس کرتے ہیں۔ سنٹرل ماڈل سکول میں داخلے سے محروم رہ جانے والوں کی حسرت قابل دید ہوتی تھی اور پھر داخلے کے لیے ''براستہ بٹھنڈہ'' والی کاوشیں قابل دید ہوتی تھیں۔ ڈی پی آئی، ڈائریکٹر سکولز اور سیکرٹری تعلیم وغیرہ کی سفارش ڈھونڈی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ لوگ ڈپٹی کمشنر وغیرہ سے بھی کہلواتے تھے؛ تاہم اس قسم کے داخلوں کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہوتی تھی۔ تبھی اس سکول کا نام بھی روشن تھا اور کام بھی اونچا تھا۔ پھر اس سکول کے ساتھ بھی وہی ہوا جو ہماری سوسائٹی میں سب اداروں کے ساتھ ہوا۔ سفارش، آرام طلبی، سرکاری سکولوں کی سرپرستی سے محرومی، چیک اینڈ بیلنس کے نظام کی بربادی اور سرکار سے کام نہ کرنے کے عوض تنخواہ لینے کے کلچر نے سارے سرکاری سکولوں کا بیڑہ غرق کر دیا۔ سنٹرل ماڈل سکول کون سا مریخ پر واقع تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو سب کے ساتھ ہوا؛ تاہم ایک روشن ستارے کا ماند پڑ جانا زیادہ دکھ کا باعث بنتا ہے، سو یہ روشن ستارہ بھی بجھ گیا۔

ڈپٹی کمشنر صاحب نے اپنے دفتر کی پچھلی جانب والی کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: اس کھڑکی کے پیچھے عدالتیں ہیں اور ان کے پیچھے سنٹرل ماڈل سکول ہے' لاہور کا سب سے روشن روایات کا حامل سکول۔ اس سکول کے طلبہ میں کیا کیا نام تھے' ملک معراج خالد، جسٹس (ر) خلیل الرحمان رمدے، جسٹس (ر) جاوید اقبال، جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ، ایئر چیف مارشل (ر) سہیل امان، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الٰہی، مولانا طارق جمیل، رمیز حسن راجہ، خالد عباس ڈار اور بہت سے اور لوگ جن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں' لیکن ایسے لوگوں کی تعداد درجنوں یا سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں میں ہے۔ 1883ء میں مڈل سکول کے طور پر قائم ہونے والا یہ سکول 1888ء میں ہائی سکول کے درجے تک اپ گریڈ کر دیا گیا۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہونے پر 1891ء میں اسے پرانی بلڈنگ سے، جو سنٹرل ٹریننگ کالج میں تھی، نئی عمارت میں شفٹ کر دیا گیا۔ تب سے یہ سکول اسی عمارت میں ہے۔ اسے قائم ہوئے قریب 136 سال ہو گئے ہیں۔ ملتان کا پائیلٹ سیکنڈری سکول اس سے تقریباً تین سال بعد قائم ہوا۔ آج پائیلٹ سیکنڈری سکول ملتان کو قائم ہوئے 133 سال ہو چکے ہیں۔ ابا جی مرحوم نے میٹرک پائیلٹ سیکنڈری سکول ملتان سے کیا تھا۔

ڈپٹی کمشنر صاحب نے اس سکول کا المیہ بیان کرنا شروع کر دیا اور سارا ملبہ سکول انتظامیہ پر، اساتذہ پر، سفارش کے کلچر پر اور حادثاتی طور پر استاد بننے والی ٹیچرز کمیونٹی پر ڈال دیا۔ میں سنتا رہا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا: برادر عزیز! یہ بتاؤ تمہارے بچے کس سکول میں پڑھتے ہیں؟ اس نے ایک مشہور انگلش میڈیم سکولوں کی چین کا نام لیا۔ میں زور سے ہنس پڑا۔ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگا: بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں نے کہا: ہنسنے کی واقعی کوئی بات نہیں، دراصل یہ رونے کی بات ہے جس پر میں غلطی سے ہنس پڑا ہوں۔ وہ پھر پوچھنے لگا: چلو ہنسنے کی بات چھوڑو، یہ بتاؤ یہ رونے والی بات کہاں سے آ گئی؟ میں نے کہا: دراصل اس سکول کے تعلیمی انحطاط، اس سکول کی بربادی اور اس نامور سکول کے تحت الثریٰ میں گرنے کی وجہ آپ لوگ ہو اور اس کا سارا ملبہ حسب معمول

دوسروں پر ڈال رہے ہو۔ پاکستان میں یہ رواج عام ہے کہ اپنی خرابیوں، کوتاہیوں اور نالائقیوں کا ملبہ دوسروں پر ڈال دو۔ کیا سیاستدان، کیا بیوروکریسی اور کیا دوسرے ادارے۔ سب کا یہی کام ہے کہ اپنی غلطی کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالو اور اپنی جان چھڑوالو۔ اگر آپ کا بچہ آج اس سکول میں پڑھ رہا ہوتا تو اس کا معیار

بھی وہی ہوتا جو اس سکول کا ہے، جہاں آج آپ کا بچہ زیر تعلیم ہے۔ جب تک آپ لوگوں کے بچے ان سرکاری سکولوں میں پڑھتے رہے' آپ لوگ ان سکولوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ ان سکولوں کو مانیٹر کرتے رہے۔ ان سکولوں کے تعلیمی معیار کے بارے میں فکرمند بھی رہے اور ان کی بہتری کے لیے کوشاں بھی رہے۔ آخر آپ کے بچوں کے طفیل آپ کی اگلی نسل کا مستقبل ان سکولوں سے وابستہ تھا۔ جیسے ہی آپ لوگوں نے اپنے بچوں کو ان سکولوں سے نکالا اور ''لش پش'' والے انگریزی میڈیم سکولوں میں داخل کروانا شروع کیا، سرکاری سکولوں کے بارے میں آپ کا سارا کنسرن ہی ختم ہوگیا۔ ملنا جلنا ختم ہو تو رشتہ داریاں ختم ہوجاتی ہیں۔ یہ ادارے کیا چیز ہیں؟ آپ کی سرپرستی ختم ہوئی، آپ کی فکرمندی رخصت ہوئی، آپ کی ان سکولوں سے اپنائیت اختتام کو پہنچی، آپ کا ان سکولوں سے رشتہ منقطع ہوا' یہ سکول لاوارث اور یتیم ہو گئے۔ حال خراب ہوگیا' تعلیمی معیار برباد ہوگیا، عمارتیں تباہ ہوگئیں، میرٹ ختم ہوگیا، اچھے طالبعلم آنا بند ہو گئے۔ آج آپ اپنے دفتر کے عقب میں واقع اس تاریخی اور نابغہ سکول سے مکمل لاتعلق ہیں۔ آپ کا اس سکول سے کوئی رشتہ نہیں، کوئی واسطہ نہیں، کوئی قلبی تعلق نہیں۔ آپ صرف مگرمچھ والے آنسو بہا رہے ہو۔ اس دکھ سے آپ کا کوئی ذاتی واسطہ یا لینا دینا نہیں ہے۔ محض قوم کا درد محسوس کرنے کا ڈرامہ کر رہے ہو۔ اگر درد ہوتا، ہمدردی ہوتی، کوئی تعلق ہوتا تو یہ سکول اس طرح تباہ نہ ہو گئے ہوتے۔ آج سرکار یہ حکم جاری کردے کہ کسی سرکاری افسر' خواہ وہ کمشنر ہو یا ڈپٹی کمشنر، چیف سیکرٹری ہو یا ڈائریکٹر سکولز' کے بچے سرکاری سکول کے علاوہ کہیں اور داخلہ نہیں لے سکتے تو تم دیکھو گے کہ انہی سکولوں کا معیار پھر سے کس طرح بلند ہوتا ہے۔ ان میں داخلے کے لیے دوبارہ سے کیسی دوڑ لگتی ہے اور یہ سکول کس طرح سے اپنی ماضی کی روایات کو زندہ کرتے ہیں۔ میرا دوست ادھر اُدھر کی مارنے لگ گیا۔ اس کے پاس میرے سوال کا کوئی منطقی جواب نہیں تھا۔

گزشتہ دنوں مجھے ایک میل آئی۔ یہ کسی پروفیسر کی تھی۔ ملتان کے گورنمنٹ کالج آف سائنس کے کسی استاد نے درد دل کا حال بیان کیا تھا۔ ملتان کا یہ تعلیمی ادارہ بڑے شاندار ماضی کا حامل ہے۔ جب میں گورنمنٹ ایمرسن کالج میں پڑھتا تھا تب یہ کالج صرف اور صرف سائنس کی تعلیم کے لیے مختص تھا۔ ایف ایس سی اور بی ایس سی کی کلاسز اس کالج میں لگتی تھیں۔ آرٹس کے طلبہ کی تعلیم کا کم از کم اس وقت اس کالج میں کوئی بندوبست نہیں تھا۔ تب خواجہ اظہر صاحب جو نہایت ہی شاندار استاد، منتظم اور ماہر تعلیم تھے اس ادارے کے پرنسپل تھے۔ ایسے پروفیسر بھی اب عنقا ہو گئے ہیں۔ کالج میں جائیں تو ایسی خاموشی اور ویرانی سی کہ لگتا تھا کہ کالج میں چھٹی ہے۔ صرف پیریڈ کے تبدیل ہونے پر چہل پہل مچتی تھی وگرنہ سو فیصد لڑکے کلاسوں میں ہوتے تھے۔ میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں اس کالج کے بہت سے لڑکے داخلہ حاصل کرتے تھے۔ آج یہ عالم ہے کہ کوئی اچھے نمبروں والا طالب علم اس ادارے میں داخلہ لینے نہیں آتا۔ اس کالج کے ایک پروفیسر نے اس المیے پر میل بھیجی ہے کہ آج وہ بطور پروفیسر شرمندہ ہے۔

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں: آج میں بطور پروفیسر شرمندہ ہوں۔ گورنمنٹ کالج آف سائنس ملتان، ملتان شہر کا تدریس، روایات، تقریبات اور نظم وضبط کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کا حامل سرکاری ادارہ ہے۔ ملتان شہر میں بوائز اور گرلز کالج کی تعداد پندرہ سے زائد ہے۔ کالج پروفیسرز کی تعداد پندرہ سو سے زائد ہے۔ بہت سے پروفیسرز کے بیٹوں نے اس سال میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے۔ لیکن ایک پروفیسر کے بیٹے نے میرے کالج میں داخلہ فارم جمع نہیں کروایا۔ میں نے خود تمام داخلہ فارمز کو چیک کیا۔ عجیب منافقت ہے نوکری سرکاری کالج کی سب سے اچھی لیکن اپنے بچوں کے لیے سرکاری کالج ناپسند۔ ہم سب پروفیسرز نے انہی کالجز میں تعلیم حاصل کی۔ چار ہزار روپے سالانہ فیس کی جگہ ایک لاکھ سالانہ فیس بھرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر پرائیویٹ کالجز میں تدریس بہتر ہے تو کیا ہم بددیانت ہیں؟ اگر وہاں ٹیسٹ سسٹم اور نظم وضبط بہتر ہے تو کیا ہم مجرمانہ غفلت اور خیانت کر رہے ہیں؟ پرائیویٹ کالجز میں داخلہ سٹیٹس سمبل بنتا جا رہا ہے۔ سرکاری کالجز کے پروفیسرز کا اپنے ادارے پر عدم اعتماد اپنے کولیگز کی قابلیت اور دیانت پر زناٹے کا طمانچہ ہے۔ مجھے دکھ ہے میں معاشرے کا اعتماد پہلے ہی کھو چکا ہوں، اب میں اپنے ساتھی پروفیسرز کا اعتماد بھی کھو چکا ہوں۔ دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف...

میرا خیال ہے اس مختصر سی میل نے ہمارے سارے سرکاری تعلیمی نظام کا پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دیا ہے اور ظاہر ہے پوسٹ مارٹم مردے کا کیا جاتا ہے زندہ کا نہیں۔

شعبہ پاکستان

جنسی تعلیم: قصور جیسے واقعات روکنے کے لیے ارم فاطمہ نے بچوں کی آگاہی کا بیڑا خود اٹھالیا

تحریر: عفیفہ چوہان

لاہور کے گنجان آباد علاقوں اور دیہات کو جانے والے کچے راستوں اور پکی سڑکوں پر اکثر آپ کو ایک سفید رنگ کی پرنٹڈ گاڑی دوڑتی نظر آئے گی۔

اس گاڑی میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز اس پر بنائے گئے مختلف اقسام کے کارٹونز ہیں۔ ان کارٹونز کو دیکھ کر آپ شاید سوچیں کہ یہ گاڑی کسی سکول کے بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہو گی۔

مگر ایسا نہیں ہے۔

لاہور کی رہائشی ارم فاطمہ نے قصور جیسے واقعات کی روک تھام کے لیے بچوں کو شعور فراہم کرنے کا بیڑا خود اٹھالیا ہے لیکن ان کا بچوں کو جنسی تعلیم دینے کا انداز روایت سے ذرا ہٹ کر ہے۔

ارم فاطمہ کا چلتا پھرتا آگاہی مرکز

یہ گاڑی ایک موبائل اویئرنیس سینٹر یا چلتا پھرتا آگاہی مرکز ہے جسے لاہور کی رہائشی ارم فاطمہ نے خاص طور پر دیہات میں رہنے اور وہیں پلنے والے بچوں کے لیے ہی بنوایا ہے۔

ارم ایک سماجی کارکن ہیں اور ایک مقامی سماجی تنظیم 'بیداری' سے منسلک ہیں۔ وہ گذشتہ 10 سال سے اسی ادارے میں بچوں اور خواتین کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔

ایک سماجی تنظیم میں کام کرنے کے باعث ارم کو معاشرے میں ہونے والی برائیوں بالخصوص بچوں سے منسلک مسائل کے بارے میں کافی معلومات ہیں اور وہ اکثر اپنی تنظیم کے ذریعے دوسرے لوگوں کی تربیت بھی کرتی رہی ہیں۔

گاڑی پر بنے کارٹونز بھی منفرد اور بامعنی ہیں۔ کہیں بچے ہاتھ سے ہاتھ جوڑے قطار بنائے کھڑے ہیں اور کہیں ایک چھوٹی سی بچی ہاتھ میں گڑیا لیے اپنی ہی عمر کے بچے کے ساتھ عروسی جوڑے میں ملبوس ہیں جو کہ نوعمری میں شادی جیسے اہم مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے۔

اسی کے ساتھ گاڑی کی بیرونی جانب بہت سے سماجی پیغامات کے ساتھ ساتھ ایمرجنسی نمبرز بھی درج ہیں جن میں بچوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے چائلڈ پروٹیکشن بیورو کا نمبر واضح ہے۔

گاڑی میں بچوں کی آگاہی کے لیے مختلف آگاہی پلے کارڈز رکھے گئے ہیں اور بہت سے کھلونے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم اور سکول کی اہمیت، مساوات اور سب سے بڑھ کر جنسی اعضا کی آگاہی اور ان کی حفاظت کے متعلق تصاویر کے ذریعے بتایا گیا۔

ان ہی تصاویر میں چائلڈ پروٹیکشن ہیلپ لائن کا نمبر بھی درج کیا گیا ہے تاکہ بچے اسے باآسانی یاد رکھ سکیں اور پھر کسی بھی ہنگامی صورت حال میں اس نمبر سے مدد لے سکیں۔

موبائل اویئرنس سینٹر کی ضرورت کیوں؟

ارم بتاتی ہیں جب وہ لاہور شفٹ ہوئیں تو قصور اور چونیاں جیسے بہت سے واقعات ان کے آس پاس گھومنا شروع ہوئے جن میں بچوں کو اغوا کرنے کے بعد زیادتی یا بدفعلی کا نشانہ بنایا گیا اور ان میں سے اکثر کو مار دیا گیا۔ بہت سے واقعات میں قاتل بچوں کا رشتہ دار یا جاننے والا نکلا۔

ایسے واقعات دیکھنے کے بعد ارم نے سوچا کہ انھیں بچوں کو بچانے کے لیے خود سے کچھ کرنا چاہیے۔

انھوں نے محسوس کیا کہ ایسے واقعات زیادہ تر دیہات میں ہو رہے ہیں جہاں لوگوں میں شرح خواندگی بھی کم ہے اور کم عمری کے باعث والدین اپنے بچوں کو مکمل تربیت نہیں دے پاتے۔

اس کے علاوہ پاکستانی معاشرے میں والدین اپنے بچوں کو جنسی آگاہی دینے سے کتراتے اور شرم محسوس کرتے ہیں۔ ماں باپ سمجھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ بچے خود ہی جنسیت کو سمجھ لیں گے۔ ان کے نزدیک یہ تعلیم اہم نہیں۔

اسی وجہ سے وہ بچوں کو سمجھا نہیں پاتے کہ بچوں نے خطرے میں یا ہراسانی کے دوران اپنا دفاع کیسے کرنا ہے اور کیسے خود کو محفوظ رکھنا ہے۔

بچوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی ایک غیر سرکاری تنظیم ساحل کے مطابق جنوری تا جون سنہ 2019 کے دوران 729 بچیاں جبکہ 575 بچے جنسی تشدد کا شکار ہوئے۔ یعنی روزانہ اوسطاً سات بچے زیادتی کا شکار ہوئے۔

جغرافیائی اعتبار سے صوبہ پنجاب میں سب سے زیادہ زیادتی کے واقعات رپورٹ کیے گئے ہیں۔

وہ بتاتی ہیں کہ یہ سب دیکھ کر انھوں نے بچوں کو خود سے شعور دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے چھٹی کے روز کو بچوں کی آگاہی مہم کے لیے وقف کر دیا۔ اس رضا کارانہ کام میں ان کے دونوں بھائیوں وقاص اور اسرار نے ان کی مدد کی۔

ارم جنسی تشدد کی آگاہی دینے کے لیے کیا کرتی ہیں؟

ارم بتاتی ہیں کہ انھوں نے اپنے بھائی کے زیر استعمال گاڑی کو بچوں کی دلچسپی کے مطابق باہر سے روغن کروایا اور ایسی تصاویر بنوائیں جن میں معلومات کے ساتھ خاموش پیغام بھی ہوں۔

ارم گاڑی لے کر لاہور کے دور دراز علاقوں خصوصاً دیہات میں جاتی ہیں جہاں وہ بچوں کو اپنے بچاؤ کی تربیت دیتی ہیں۔ بچوں کو سمجھانے کے لیے وہ مختلف نفسیاتی سیشنز تیار کرتی ہیں۔

اس کے ساتھ وہ والدین کو اپنے بچوں کی حفاظت کے حوالے سے شعور بھی دیتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو اس خطرے سے لڑنے کے قابل بنایا جائے۔

آگاہی سیشن میں بچوں کو کیا سکھایا جاتا ہے؟

ارم بتاتی ہیں کہ انھوں نے اپنی مدد آپ کے تحت بچوں کے لیے آگاہی سیشن ترتیب دیا اور سیشن کے دوران استعمال ہونے والی اشیا کا انتظام انھوں نے گھر سے کیا تھا۔

ارم ہر دیہات کا پہلے سے دورہ کرتی ہیں، وہاں کے علاقہ مکینوں سے بات کرتی ہیں، وہاں کے لوگوں کو گاؤں میں اپنے آنے کے مقصد سے آگاہ کرتی ہیں اور ہفتے کے کچھ دن مخصوص کر کے انھیں آگاہی سیشن دینے پہنچتی ہیں۔

مقررہ دن وہ وہاں پہنچ کر اپنا سامان سیٹ کرتی ہیں اور لاؤڈ سپیکر سے بچوں کو پکارتی ہیں۔ بچے ان کی آواز سن کر فوراً جمع ہو جاتے ہیں اور پھر ارم اپنا سیشن شروع کر دیتی ہیں۔

وہ بچوں کو مختلف تصاویر اور خطرناک جانوروں کے کھلونے دکھا کر ان میں پہلے خطرے کا شعور پیدا کرتی ہیں، پھر اسی شعور کو وہ انسانوں سے جوڑ دیتی ہیں کہ بچوں کو خطرہ کن اور کس طرح کے لوگوں سے ہو سکتا ہے۔

'موبائل اویئرنیس سینٹر میں ہم نے کھلونے اور پلے کارڈز رکھے ہیں جن کے ذریعے بچوں کے اندر تحفظ اور خطرے کا شعور پیدا کیا جاتا ہے جبکہ مائیک اور لاؤڈ سپیکرز بھی موجود ہیں تاکہ آس پاس کے گھروں اور دکانوں پر موجود والدین بھی جان سکیں کہ ان کے بچوں کو کیا سکھایا، سمجھایا اور بتایا جا رہا ہے۔'

اپنا دفاع کیسے کرنا چاہیے؟

سیشن کے دوران ارم بچوں کو اپنے دفاع کے گر بتاتی ہیں۔

وہ انھیں بتاتی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے مخصوص اعضا کو چھونے کی کوشش کرے تو انھیں کیسے چیخنا چاہیے اور اگر کوئی ان کو پکڑنا چاہے تو اپنا دفاع کرتے ہوئے مدمقابل کو کیسے ٹانگ مار کر بھاگنا چاہیے۔

وہ بچوں کو عملی طور پر بھاگ کر بھی دکھاتی ہیں اور بچے بھی ان کی طرح ہی بھاگتے ہیں۔

یہی نہیں، سیشن میں انھیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ 'خطرہ' ان کو ان کی پسندیدہ چیز کا لالچ بھی دیتا ہے۔ وہ انھیں بتاتی ہیں کہ انھوں نے لالچ میں نہیں آنا۔ وہ انھیں بتاتی ہیں کہ ان کے والدین ہی ان کا تحفظ ہیں چنانچہ والدین کو فوری اور ضروری بتانا ہے۔

ارم کے مطابق بچوں کے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد کے ایسے واقعات میں ایک وجہ والدین اور بچوں کے درمیان دوستی نہ ہونا بھی ہے۔ وہ والدین کو بھی سیشن دیتی ہیں اور انھیں آگاہ کرتی ہیں کہ کیسے انھوں نے اپنے بچوں کے ساتھ دوستی پیدا کرنی ہے تاکہ وہ بلا جھجک اپنے والدین کو اپنے مسائل بتا سکیں۔

'بچوں کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ والدین اور بچوں کی دوستی ہو کیونکہ جب والدین اور بچوں میں خلا ہو گا تو کوئی بھی اجنبی درمیان میں آ کر اس فاصلے کو پر کرنے کی کوشش کرے گا۔'

اپنی مدد آپ کے تصور کا فروغ

ارم کہتی ہیں کہ ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے ہم کب تک اس انتظار میں رہیں گے کہ کوئی باہر سے آئے گا اور ہمارے بچوں کو بتائے گا۔ 'ہمیں اپنے بچوں کو خود بتانا ہے اور ہمیں اپنی مدد آپ کو فروغ دینا چاہیے۔'

'اپنی مدد آپ کے تحت اگر ہم چاہیں تو ہم یہ ذمہ داری بہتر نبھا سکتے ہیں ہم بچوں کو سمجھا سکتے ہیں اور ان کو تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔'

تاہم ان کے مطابق حکومت کو بھی چاہیے کہ بچوں کے حوالے سے قوانین میں ترمیم کرے اور سکولوں میں بھی جنسی آگاہی کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

مرنے سے پہلے ایک خواہش

ارم کینسر کی مریضہ بھی ہیں۔ انھیں بیضہ دانی کا سرطان ہے اور ڈاکٹرز کے مطابق ان کی زندگی بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے جسم سے تولیدی نظام نکال دیا جائے۔

اس سے پہلے بھی ارم کے متعدد بار آپریشنز ہو چکے ہیں مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ارم کا کہنا ہے کہ بچوں کے ساتھ گزارے گئے وقت سے انھیں طاقت ملتی ہے اور ان میں جینے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔

'جب ڈاکٹرز نے مجھے بتایا کہ میرے پاس کوئی اور حل نہیں ہے تو ایک عورت ہوتے ہوئے یہ میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔ تین چار دن میں بہت روتی رہی مگر پھر میں نے فیصلہ کیا کہ جتنی بھی زندگی میرے ہاتھ میں باقی ہے اسے بچوں کے لیے مخصوص کر دوں۔'

'موت میرے ساتھ ساتھ میرے پیچھے پیچھے چل رہی ہے مگر جب میں ان بچوں کے ساتھ ہوتی ہوں مجھے اپنی تکلیف بھول جاتی ہے۔'

❁❁❁

شعبہ پاکستان

بلوچستان یونیورسٹی: ’ہراس کیے جانے کے الزامات درست ہوئے تو ہم انسان کہلانے کے قابل نہیں‘

تحریر: محمد کاظم

پاکستان میں صوبہ بلوچستان کی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جمال خان مندوخیل نے کہا ہے کہ یونیورسٹی آف بلوچستان میں طالبات کو مبینہ طور پر ہراس کیے جانے کے حوالے سے جو دعوے سامنے آئے ہیں ’وہ خدا کرے کہ درست نہ ہوں کیونکہ اگر وہ درست ہوئے تو پھر ہم اس قابل نہیں کہ انسان کہلائیں‘۔

چیف جسٹس نے کہا کہ ایسی باتیں بھی سامنے آئی ہیں کہ ’اے گریڈ چاہیے یا فیل ہونا ہے، سکالرشپ پر آسٹریلیا جانا ہے یا امریکہ جانا ہے یا کہیں نہیں جانا۔‘

جسٹس جمال خان مندوخیل نے کہا کہ ’ہم سب نے مل کر دو کام کرنے ہیں ایک یہ کہ یونیورسٹی کی ساکھ بحال ہو اور دوسرا یہ کہ جو لوگ ہراس کیے جانے کے واقعات میں ملوث رہے ہیں ان کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے‘۔

یہ ریمارکس انھوں نے یونیورسٹی میں طالبات کو مبینہ طور پر ہراساں کیے جانے سے متعلق کیس کی سماعت کے دوران دیے۔

سماعت کے موقع پر بلوچستان اسمبلی کے پارلیمانی کمیٹی کے اراکین، یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر محمد انور پانیزئی، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے نمائندوں کے علاوہ وکلا کی بہت بڑی تعداد کمرہ عدالت میں موجود تھی۔

سماعت کے دوران ایف آئی اے کے حکام نے ایک مرتبہ پھر یونیورسٹی میں خفیہ کیمروں کے استعمال کے حوالے سے ایک رپورٹ اس درخواست کے ساتھ پیش کی کہ تحقیقات مکمل ہونے تک اسے افشاں نہ کیا جائے، تاہم چیف جسٹس نے ایف آئی اے کی رپورٹ سے بلوچستان اسمبلی کے اراکین کو آگاہ کرنے کے لیے انھیں اپنے چیمبر میں طلب کیا۔

قائم مقام وائس چانسلر کی ’بے بسی‘

سماعت کے دوران جب چیف جسٹس نے قائم مقام وائس چانسلر سے کہا کہ وہ قانون کی مطابق کارروائی کریں تو وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے رہے۔

چیف جسٹس نے انھیں کہا کہ قانون کے تحت انھیں طالبات کو ہراس کیے جانے سے متعلق معاملات کی تحقیقات اور اس کے ذمہ دار افراد کے خلاف کارروائی کا مکمل اختیار ہے۔

بلوچستان اسمبلی کے اراکین نے کیا کہا؟

بلوچستان اسمبلی کی تحقیقاتی کمیٹی کے اراکین چیئر پرسن مہ جبین شیران کی قیادت میں پیش ہوئے۔

چیئر پرسن نے کہا کہ انھیں ہراس کیے جانے سے متعلق بہت ساری شکایتیں، فون کالز موصول ہوئیں لیکن متاثرین میں سے تاحال کوئی بھی کمیٹی کے سامنے پیش نہیں ہوا۔

کمیٹی کے رکن ثنا بلوچ نے کہا کہ یونیورسٹی میں بڑی تعداد میں سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہیں لیکن ان کے استعمال کے حوالے سے کوئی سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجر موجود نہیں ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ ’یونیورسٹی میں جو لوگ سکیورٹی یا سی سی ٹی وی کو آپریٹ کرنے پر معمور ہیں ان کی اخلاقی اور ہماری سماجی اقدار کے حوالے سے تربیت ہونی چاہیے‘۔

انھوں نے کہا کہ اس وقت لوگوں کی نگاہیں عدلیہ، بلوچستان اسمبلی اور ایف آئی اے پر ٹکی ہوئی ہیں۔

اسمبلی کی رکن شکیلہ نوید نے عدالت میں الزام عائد کیا کہ ’کچھ عرصہ پہلے بیشتر سکیورٹی اہلکار گرلز ہاسٹل میں رات کو آئے اور وہاں کمرہ نمبر دو کو خالی کرایا‘۔

ان کا کہنا تھا کہ ’ہاسٹل میں لڑکیاں چیختی رہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور رات کو یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟‘

انھوں نے بتایا کہ جب کمیٹی کے اراکین نے ہاسٹل کے چوکیدار سے پوچھا کہ انھوں نے سکیورٹی اہلکاروں کو کیوں آنے دیا تو ان کا جواب یہ تھا کہ وہ ہاسٹل کے دروازے سے نہیں آئے بلکہ سیڑھیاں لگا کر اندر داخل ہوئے۔

انھوں نے کہا کہ اس کی ویڈیو بھی ہے جسے وہ چیمبر میں فاضل ججوں کو

دکھائیں گی۔

اس بات پر چیف جسٹس نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر سے کہا کہ 'سیکیورٹی اہلکار وہاں حفاظت کے لیے ہیں یا لوگوں کو ہراساں کرنے کے لیے'۔

ہیومن رائٹس کمیشن کے نمائندے نے کیا کہا؟

ہراس کیے جانے کے الزامات کی خبروں کے بعد ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے اراکین نے بھی یونیورسٹی کا دورہ کیا تھا۔

کمیشن کے بلوچستان چیپٹر کے سربراہ حبیب طاہر ایڈووکیٹ نے بتایا کہ کمیشن کے اراکین نے نہ صرف اب یونیورسٹی کا دورہ کیا ہے بلکہ اس سے پہلے بھی ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے یونیورسٹی کے امور کا جائزہ لیا تھا۔

انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کے اندر فرنٹیئر کور کے اہلکاروں کی ایک بڑی تعداد تعینات ہے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا گھر، جمنیزیئم اور ایک ٹیچرز ہاسٹل بھی ایف سی کے استعمال میں ہے۔

انھوں نے کہا کہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ یونیورسٹی کی اپنی سیکیورٹی کافی ہے اس لیے ایف سی کے اہلکاروں کی یونیورسٹی کے اندر تعیناتی کی ضرورت نہیں ہے۔

اس موقع پر ایک خاتون وکیل جمیلہ ایڈووکیٹ نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ 'ایف سی کے اہلکاروں نے یونیورسٹی کے اندر ایک تفتیشی مرکز بھی بنایا ہے جہاں وہ باہر سے لوگوں کو گرفتار کر کے تفتیش کے لیے لاتے ہیں'۔

چیف جسٹس نے اس پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر کو ہدایت کی کہ وہ جمنیزیئم، ٹیچرز ہاسٹل اور وائس چانسلر کے گھر کو دو دن کے اندر ایف سی کے اہلکاروں سے خالی کرائیں۔

'ہراس سے متاثرہ کوئی شخص ایف آئی اے کے سامنے پیش نہیں ہوا'

اس کیس میں کوئی بھی خاتون ایف آئی اے میں کیس رجسٹر کرانے کے لیے سامنے نہیں آئیں جس پر عدالت کے کہنے پر ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان شہک بلوچ شکایت کنندہ بنے تھے۔

انھوں نے سماعت کے دوران بھی ایک کیس کا حوالہ دیا۔

انھوں نے عدالت میں کہا کہ 'ایک ڈیپارٹمنٹ کی طالبہ کو اس کے ایک ٹیچر نے کہا کہ آپ کا سمیسٹر ڈراپ ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس کو ڈراپ نہیں ہونے دوں گا۔ اس طالبہ کو ان کے ڈیپارٹمنٹ کے دو ٹیچروں نے تین گھنٹے تک اپنے پاس بٹھائے رکھا'۔

انھوں نے سوال کیا کہ اس حوالے سے اب تک یونیورسٹی کے چھوٹے گریڈ کے چار اہلکاروں کو معطل کیا گیا لیکن معاملے کو اس سے آگے کیوں نہیں بڑھایا گیا۔

انھوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ 'کل ایف آئی اے والے آئیں گے اور یہ بتائیں گے کہ متاثرین میں سے کوئی سامنے نہیں آیا اس لیے کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتائیں گے کہ آئندہ ایسے واقعات سے بچنے کے لیے فلاں فلاں گائیڈ لائنز پر عملدرآمد کیا جائے'۔

تاہم چیف جسٹس نے کہا کہ عدالت ایسا نہیں ہونے دے گی کیونکہ یہ معاملہ نہ صرف اس بینچ کے اراکین دیکھ رہے ہیں بلکہ عدالت کے تمام جج اس کی مانیٹرنگ کر رہے ہیں۔

چیف جسٹس نے وائس چانسلر اور ایف آئی اے کے حکام کو کہا کہ 'جو بھی ان واقعات میں ملوث ہو ان کے خلاف بلاامتیاز کارروائی کریں خواہ اس میں میں خود (چیف جسٹس) ہی کیوں نہ ہوں۔'

انھوں نے کہا کہ متاثرین کو ایف آئی اے یا بلوچستان اسمبلی کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونا چاہیے تا کہ ان واقعات میں ملوث عناصر کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

عدالت نے کیا احکامات دیے؟

عدالت نے کیس کی سماعت 15 دن بعد تک ملتوی کرتے ہوئے ایف آئی اے کے حکام کو حکم دیا کہ وہ اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔

عدالت نے وائس چانسلر کو حکم دیا کہ وہ یونیورسٹی کی جمنیزیئم، وائس چانسلر کے گھر اور ٹیچرز ہاسٹل سمیت ان تمام مقامات کو ایف سی اہلکاروں سے خالی کرائیں جو کہ طلبا اور اساتذہ کے لیے مختص ہیں۔

عدالت نے کہا کہ کیس کی سماعت کے دوران یہ دلائل بھی سامنے آئے کہ یونیورسٹی کے اندر فرنٹیئر کور کی ضرورت نہیں۔

عدالت نے کہا کہ چیف سیکرٹری، وائس چانسلر، ایڈیشنل چیف سیکرٹری ہوم اور ڈپٹی کمشنر کوئٹہ کو اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ اگر ایف سی کی ضرورت ہے تو ان کے لیے یونیورسٹی کے باہر کون سی جگہ مختص ہونی چاہیے۔

بابا گرو نانک یونیورسٹی
'دوسری یونیورسٹیوں سے تھوڑی مختلف' کیسے ہوگی؟

تحریر: ترہب اصغر

حکومت پاکستان کی جانب سے سکھ برادری کے لیے ایک یونیورسٹی کے قیام کے اعلان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پنجاب کے شہر ننکانہ صاحب میں وزیر اعظم پاکستان عمران خان نے بابا گرو نانک یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔

اس سے قبل گذشتہ حکومت سے تعلق رکھنے والے سابق چیئرمین متروکہ وقف املاک بورڈ صدیق الفاروق نے 2016 میں سکھ مذہب کے بانی اور روحانی پیشوا بابا گرو نانک کے 547 ویں یوم پیدائش کے موقع پر بتایا تھا کہ بابا گرو نانک یونیورسٹی 400 ایکڑ پر تعمیر کی جائے گی جس میں پنجابی کے علاوہ دیگر مضامین بھی پڑھائے جائیں گے۔

یونیورسٹی کی اہمیت

ننکانہ صاحب میں ہونے والی تقریب میں وزیر اعلیٰ پنجاب عثمان بزدار کا کہنا تھا کہ بابا گرو نانک یونیورسٹی کا قیام اہمیت کا حامل ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ یونیورسٹی کی تعمیر پر چھ ارب روپے لاگت آئے گی جبکہ یونیورسٹی تین مرحلوں میں مکمل کی جائے گی۔

'اس یونیورسٹی کے قیام سے علاقے کے لوگوں کو بے پناہ فائدہ پہنچے گا کیونکہ دنیا بھر کے لوگ، خصوصاً سکھ برادری، اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے ننکانہ صاحب آئیں گے۔'

پنجاب کے وزیر برائے اعلیٰ تعلیم راجہ یاسر ہمایوں کے مطابق بابا گرو نانک یونیورسٹی کی تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے جس کے لیے انھیں پنجاب حکومت کی جانب سے دو ارب روپے کی پہلی قسط مل چکی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ 'ہم نے یونیورسٹی کی باہر کی دیوار تعمیر کر لی ہے جبکہ اس یونیورسٹی کی تعمیر و تکمیل مکمل ہونے میں تین سال کا عرصہ درکار ہے۔'

'یونیورسٹی کا نقشہ سکھوں کے طرز تعمیر کے مطابق بنایا گیا ہے۔'

ان کا کہنا تھا کہ تعمیر کے بعد ہی پڑھنے کی خواہش رکھنے والے طالب علم یہاں داخلہ لے سکیں گے۔

بابا گرو نانک یونیورسٹی میں کیا پڑھایا جائے گا؟

وفاقی وزیر داخلہ برگیڈیئر ریٹائرڈ اعجاز شاہ کا کہنا تھا کہ یہ یونیورسٹی دوسری یونیورسٹیوں سے تھوڑی مختلف ہوگی۔

'اس یونیورسٹی میں طالب علموں کو دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ خالصہ اور پنجابی بھی پڑھائی جائے گی۔'

وہ کہتے ہیں کہ حکومت اسے انٹرنیشنل یونیورسٹی بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔

انھوں نے مزید بتایا کہ سکھوں کے علاوہ کوئی بھی باہر سے آ کر یہاں اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر سکے گا اور یہاں باہر سے آنے والوں کے لیے ہاسٹل بھی تعمیر کیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے باہر سے آنے والے طالب علموں کے لئے ہاسٹل بھی تعمیر کیا جائے گا تاکہ وہ یہاں آ کر رہ سکیں۔

صوبائی وزیر تعلیم یاسر ہمایوں نے بتایا کہ یونیورسٹی میں پانچ شعبہ جات قائم کیے جائیں گے۔ ان میں مذہب و عقائد، لبرل آرٹس اور سائنس، فنِ تعمیر، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور جنوبی ایشیائی علوم شامل ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ پنجابی اور خالصہ زبانیں سکول آف لبرل آرٹس اور سائنسز میں پڑھائی جائیں گی۔

'سکول آف تھیالوجی میں صوفی ازم، روحانیت اور بابا گرو نانک کی تعلیمات کے حوالے سے پڑھایا جائے گا اور دنیا بھر میں یہ یونیورسٹی روحانیت کی تعلیم کے حوالے سے جانی جائے گی۔'

انھوں نے دعویٰ کیا کہ دوسرے ممالک میں سکھ کمیونٹی کے لوگوں نے اس پراجیکٹ میں فنڈنگ کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہاں 10 ہزار طالب علم تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

جبکہ یونیورسٹی کے ہر شعبہ تعلیم کے لیے ہم دنیا بھر کے ماہرین کو مدعو کریں گے تاکہ وہ اپنی ماہرانہ رائے دے سکیں۔

سکھ بابا گرو نانک یونیورسٹی کو کیسے دیکھتے ہیں؟

سابق ایم پی اے پنجاب اسمبلی سردار رمیش سنگھ اروڑہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹی بنانے کا اعلان 14 سال پہلے کیا گیا تھا لیکن آج تک کوئی حکومت اسے مکمل نہیں کر سکی۔

تاہم انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کا قیام خوشی کی بات ہوگی۔

'اس یونیورسٹی کے قیام سے دنیا بھر میں پاکستان کا مثبت چہرہ دیکھا جائے گا۔ کرتار پور راہداری منصوبے کے بعد اس یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا جانا انتہائی اچھا عمل ہے۔'

وہ کہتے ہیں کہ 'حکومت کے اس اقدام سے دنیا میں پاکستان سے متعلق شکوک و شبہات بھی دور ہو جائیں گے اور یہ تاثر جائے گا کہ پاکستان اپنی اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔'

وہ کہتے ہیں کہ لوگ پاکستان آ کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ 'ہماری تعلیم زیادہ مہنگی نہیں ہے۔ لوگ پاکستان میں سستی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اس یونیورسٹی میں آئیں گے۔'

'پنجاب حکومت کو اپنے کندھوں کو مضبوط کرنا ہوگا کیونکہ اس یونیورسٹی کے ساتھ بابا گورو نانک جی کا نام منسلک ہو گیا ہے۔'

انسان کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت

تحریر: خطیب احمد

خالق کائنات کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ انسان کی پہلی درسگاہ اسکا گھر ہوتا ہے جہاں اسکی پرورش کی جاتی ہے۔ جس سے اسے ایک خاص طرح سے سوچنے اور عمل کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے۔ نیک عورت کی گود میں پلنے بڑھنے والا بچہ یقیناً ایک اچھا انسان اور بہتر مسلمان ہوتا ہے۔ یہ بچہ ماں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس میں عزت نفس، وفاکشی اور غیرت کی وہ تمام خوبیاں موجود ہوتی ہیں جو خود اس کی ماں میں موجود تھیں۔ انسان میں موجود جہالت صرف تعلیم سے نہیں بلکہ پرورش سے بھی ختم ہوتی ہے۔

تعلیم ہر انسان چاہے وہ امیر ہو یا غریب ، مرد ہو یا عورت کی بنیادی ضرورت میں سے ایک ہے۔ یہ انسان کا بنیادی حق ہے جو کوئی نہیں چھین سکتا۔ اگر دیکھا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق تعلیم ہی کی بدولت ہے۔ تعلیم کسی بھی قوم یا معاشرے کے لئے ترقی کی ضامن ہے۔ یہی تعلیم قوموں کی ترقی اور زوال کی وجہ بنتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا مطلب صرف سکول، کالج، یونیورسٹی سے کوئی ڈگری لینا نہیں بلکہ اسکے ساتھ تمیز اور تہذیب سیکھنا بھی ہے تاکہ انسان اپنی معاشرتی روایات اور سماج کا خیال رکھ سکے۔ تعلیم وہ زیور ہے جو انسان کا کردار سنوارتی ہے۔ اس دنیا میں ایسے افراد بھی جنم لیتے ہیں جن کے نزدیک تعلیم و تہذیب کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور اس فانی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ انسان کا دنیا میں برتاؤ کیسا ہونا چاہیئے، اس کے لیے لازمی ہے کہ ہمیں علم ہو کہ انسان کیا ہے اور اسکی تخلیق کا کیا مقصد ہے۔

دنیا میں ہر چیز بانٹنے سے گھٹتی ہے مگر تعلیم ایک ایسی دولت ہے جو بانٹنے سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھ جاتی ہے اور انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ تعلیم کی وجہ سے دیا گیا ہے ورنہ حیوان اور جانور میں کوئی فرق نہ رہتا۔ تعلیم حاصل کرنا ہر مذہب میں جائز ہے۔ اسلام میں تعلیم حاصل کرنا فرض کیا گیا ہے۔ آج کے اس پر آشوب اور تیز ترین دور میں تعلیم کی ضرورت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ حالانکہ آج کا دور کمپیوٹر کا دور ہے، ایٹمی ترقی کا دور ہے، سائنس اور صنعتی ترقی کا دور ہے مگر اسکولوں میں بنیادی عصری تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، انجینئرنگ، وکالت، ڈاکٹری اور مختلف جدید علوم حاصل کرنا آج کے دور کا لازمی تقاضہ ہیں۔

مسلمان بھی کبھی جدید تعلیم سے دور نہیں رہے بلکہ جدید زمانے کے جتنے بھی علوم ہیں زیادہ تر کے بانی مسلمان ہی ہیں۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم و تربیت میں معراج پا کر دین و دنیا میں سربلندی اور ترقی حاصل کی لیکن جب مسلمان علم اور تعلیم سے دور ہوئے وہ غلام بنالیئے گئے یا پھر جب بھی انہوں نے تعلیم کے مواقع سے خود کو محروم کیا وہ بحیثیت قوم اپنی شناخت کھو بیٹھے۔

آج پاکستان میں تعلیمی ادارے دہشت گردی کے نشانہ پر ہیں۔ دشمن طاقتیں معصوم لوگوں کو تعلیم کی طرف سے بدگمان کر کے ملک کو کمزور کرنے کے درپے ہیں۔ ایسے عناصر بھی ملک میں موجود ہے جو اپنی سرداری، جاگیرداری کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مفادات کی وجہ سے اپنے اثر و رسوخ والے علاقوں میں بچوں کی تعلیم میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہ بچوں کی تعلیم کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں، کیونکہ وہ کم اجرت پر ان بچوں سے کام کروانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے دیہاتی علاقوں میں شرح خواندگی کم ہے۔ جسکی وجہ سے اکثر بچے تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا نوجوان طبقہ تعلیم کی ریس میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ دوسری جانب سیاستدان تعلیم کے فروغ اور اس کے پھیلاؤ کے خلاف ہیں۔ اسکے علاوہ سرکاری حکام بھی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کے تعلیم کی وجہ سے عوام میں شعور پیدا ہوگا اور اس طرح عوام کو سیاستدانوں اور اعلیٰ سرکاری حکام کا اصل چہرہ نظر آجائے گا۔

مغرب کی ترقی کا راز صرف تعلیم کو اہمیت دینا اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔ اسی تعلیم کے بل پر انہوں نے پوری دنیا کو فتح کیا ہے۔ مغرب کی کامیابی اور مشرق کے زوال کی وجہ بھی تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ دنیا کے وہ ملک جن کی معیشت تباہ ہو چکی ہے ان کا دفاعی بجٹ تو اربوں روپے کا ہے، مگر تعلیم کا بجٹ نہ ہونے کے برابر ہے، یہی ان کی تباہی کا باعث ہے۔ اگر کوئی بھی ملک چاہتا ہے کہ وہ ترقی کرے تو ان کو چاہیے کہ وہ اپنی تعلیمی اداروں کو مضبوط کریں۔ آج تک جن قوموں نے ترقی کی ہے وہ صرف علم کی بدولت کی ہے۔ صرف علم حاصل کرنا ضروری نہیں بلکہ اس کا اطلاق بھی ضروری ہے۔ اسی طرح صرف خواہش کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسکے حصول کے لیے عمل بھی کرنا چاہیئے۔

ہمیں چاہیئے کہ تعلیم حاصل کریں اور اس کا صحیح استعمال کریں اور اگر ایسا ممکن ہوا تو وہ دن دور نہیں کہ ہم دنیا کے ان ملکوں میں شمار ہونا شروع ہو جائیں گے جو جدید علوم سے آگاہی رکھتے ہیں۔

جنگ آزادی مئی 1857ء اور میو قوم

تحریر: سکندر سہراب میو

جس قوم نے مادر وطن کو غیروں کی غلامی سے بچانے کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دیں اور جب غداروں کی ضمیر فروشی کے نتیجے میں ملک کو غیروں نے اپنا غلام بنالیا تو جس قوم نے زنجیر غلامی کو توڑنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی اور سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کیا، جس کی جدی پشتی ملکیتی زمینیں اور جاگیریں انگریزوں نے اس لئے ضبط کرلیں کہ اس قوم نے جنگ آزادی میں انگریزوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا، اس کا ذکر تاریخ میں کہیں نہیں۔ اس قوم کے ہیروز کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ لکھنے والوں کو اس کی قوم کا نام لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میرا اشارہ میو اور میواتیوں کی طرف ہے۔

1857ء کے غازیوں میں سب سے بڑا نام بھونری کے جنرل بخت کا ہے۔ جو میوات میں بھونری کی پہاڑیوں میں دفن ہے۔ انگریز آخر دم تک جس کا پتہ نہ لگا سکے۔ اگر ہمارے بزرگ ہمیں اس بات سے آگاہ نہ کرتے کہ جنرل بخت میو تھا۔ وہ اور ایک شہزادہ (جسے کسی شہزادی نے یہ کہہ کر اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا کہ جنرل میرا بیٹا آپ کے پاس امانت ہے) بھونری کی پہاڑیوں میں دفن ہیں، اگر ظہیر دہلوی دلّی کا آنکھوں دیکھا حال میں جنرل بخت کا حلیہ ٹھیٹ میو کا بیان نہ کرتا اور عشرت رحمانی اپنی 57ء کی تاریخ میں جنرل بخت کی زبان سے نکلا ہوا ٹھیٹ میواتی زبان کا یہ فقرہ نقل نہ کرتا کہ ”ہم جاکی مونڈی پہ پنہاں دھر دیاں اُو باشاہ بن جاوے“ یعنی ہم جس کے سر پر اپنی جوتی رکھ دیتے ہیں وہ بادشاہ بن جاتا ہے“ تو ہمیں شاید کبھی معلوم نہ ہوتا کہ جنگ آزادی 57ء کا عظیم ہیرو جنرل بخت میو تھا۔ یار لوگ تو اسے بے دھڑک روہیلہ پٹھان لکھتے ہیں۔ اس فقرے سے متعلق واقعہ مختصر یہ ہے کہ جب الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ جیسے غداروں کی سازشوں سے انگریز دہلی پر قابض ہو گئے تو جنرل بخت، بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پاس گیا اور اسے دہلی چھوڑ کر کسی اور محفوظ جگہ سے لڑائی جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ بادشاہ نے آمادگی ظاہر کی اور اگلے دن ہمایوں کے مقبرے میں ملنے کو کہا۔ انگریزوں نے الٰہی بخش کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ بادشاہ کو انقلابیوں کے ساتھ جانے سے روکے۔ جنرل بخت کے جاتے ہی وہ بادشاہ کے پاس آیا اور بڑھاپے، برسات، بیگمات، شہزادے، شہزادیوں اور سفر کی صعوبتوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ بادشاہ تذبذب کا شکار ہوگیا۔ اس پر اس نے یہ وعدہ کیا وہ انگریزوں سے بادشاہ کی صلح کرادے گا۔ اس پر ایک خواجہ سرا نے کہا ”حضور۔۔ صاحب عالم الٰہی بخش تو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، آپ بخت خاں بہادر کی گذارش پر توجہ فرمایئے۔ مرنا اور تکلیف اٹھانا تو زندگی کے ساتھ ہے“ بادشاہ نے اس کے کہے پر توجہ نہ دی۔ الٰہی بخش ہر بات کی اطلاع انگریزوں کو دے رہا تھا۔ حکم آیا کہ جیسے بھی ہو 24 گھنٹے تک بادشاہ کو روکو۔ جنرل بخت اگلے دن بادشاہ کے پاس آیا تو الٰہی بخش بھی موجود تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ ہتھے سے اکھڑنے والا ہے تو اس نے جنرل بخت پر چوٹ کی کہ لارڈ گورنر صاحب لگتا ہے آپ جہاں پناہ کی آڑ میں خود حکومت کرنا چاہتے ہیں“ اس پر جنرل بخت نے غصے میں تلوار کھینچی اور کہا ”ہم جاکی منڈی پہ پناہ دھر دیواں او باشاہ بن جاوے ہے“۔

اس پر بادشاہ نے کہا کہ بہادر ہمیں تیری ہر بات کا یقین ہے مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے۔ ہم اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتے ہیں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو“ جنرل بخت چلا گیا، الٰہی بخش کی مخبری پر ہڈسن فوجی دستے کے ساتھ گرفتار کرنے کے لئے ہتھکڑیاں لے کر آیا تو بادشاہ کی آنکھیں کھلیں کہ اس ساتھ دھوکا ہو گیا۔ اس نے کہا، بخت کو بلاؤ مگر تب بخت دور جا چکا تھا۔

1857ء میں دلی کے جنوب میں سرائے لاٹ سے لے کر الور تک اور متھرا سے لے کر نارنول تک میوات تھا۔ یہی وہ علاقہ تھا جو انگریزوں کے لئے قبرستان بن گیا۔ میوات کا ایک ایک گاؤں انگریز کی تربیت یافتہ، منظم، جدید ترین اسلحہ سے لیس فوج کے لئے سخت میدان جنگ ثابت ہوا۔ بریگیڈیر جنرل شاور کے الفاظ میں ”مجھ پر ہر اس گاؤں میں حملہ ہوا جہاں سے میں گذرا۔ مجھے دشمنوں کے خلاف لگاتار ہوشیار رہنا پڑا“ میواتی کسانوں نے ہل کے دستہ کی جگہ تلوار کا دستہ پکڑ لیا اور باز کی طرح فرنگی افواج پر ٹوٹ پڑے پہلے سوہنا اور تاؤڑو کے درمیان ایڈن سے لوہا لیا۔ بعد ازاں نوح میں انگریزوں کا صفایا کیا۔ رائے سینا میں کلیوفورڈ کا سر قلم ہونے سے انگریز فوج حیرت زدہ ہوگئی۔ گھاسیڑہ، روپڑا کا، مہُو، فیروزپور، دوہا، پنگواں ہوڈل میں انگریز فوج کو وہ سبق سکھایا کہ انگریز فوج بھی ان کی بہادری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ لارڈ کیننگ کے الفاظ میں ”میو قوم نے مسلمان بادشاہوں کو بھی تنگ کیا تھا، ہمیں تو کچھ زیادہ ہی پریشان کیا ہے“ اس کے علاوہ اندور، گوالیار، علی گڑھ، الہ آباد، ناگپور، جھانسی، بجنور، بلند شہر اور پیلی بھیت کے میواتیوں نے بھی انگریزوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ اگرچہ پٹیالہ، جیند، نابھا، الور، گوالیار، کوٹہ، میواڑ، مارواڑ اور جنوب کی بیشتر ریاستوں کے حکمرانوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا یا الگ تھلگ رہے، اس کے باوجود ان علاقوں میں باغی عوام کو دبانے کے لئے انگریزوں کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا۔ سکھ، مراٹھے، راجپوت، مغل، ترک، پٹھان، گورکھا، جاٹ اور میو برادری نے بڑی جانبازی دکھائی مگر فرنگیوں کی سیاست، منصوبہ بندی اور جدید ہتھیار ہندوستانیوں پر جتنے بھاری پڑے، اس سے زیادہ غداروں اور قوم فروشوں نے انقلابیوں کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی میں اپنا گھناؤنا کردار ادا کیا۔ دلی کے جنوب میں واقع اور ہریانہ کے ساتھ مشرقی راجستھان کے الور اور بھرت پور اضلاع میں پھیلے ہوئے میوات کے عوام نے انگریزوں سے ملک کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے معروف میواتی شہیدوں میں پنگواں کا سالار صدر الدین جو سقوط دہلی کے بعد

بھی کوئی تین ماہ تک انگریزوں کا مقابلہ کرتا رہا، یہاں تک اس کے بیٹے اور پھر خود بھی شہید ہوگیا۔ دلی کا میجر حور خاں، اندور کا سعادت خاں میواتی، الہ آباد کا مولوی لیاقت علی، پپلی بھینت کا علی خاں میواتی، رائے سینا کا علی حسن خاں میواتی، الور کا لعل بہادر خاں میواتی اور بسئی کھوڑ کا کالے خاں توپچی (جس کی توپ کے بے خطا گولوں نے انگریز کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا، جب تک وہ کشمیری دروازے پر ڈٹا رہا، اس کی توپ گولے اگلتی رہی اور انگریزوں کو دلی میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب غداروں نے اپنے انگریز آقا کے کہنے پر بارود میں رائی، ریت اور پانی ملا دیا اور بارود کی جگہ پالش شدہ باجرہ بھجوایا جانے لگا اور پھر آخر 7، اگست 57ء کو بارود خانہ جو شمرو بیگم کی حویلی واقع محلہ چوڑی والان میں تھا اڑا دیا گیا تو کالے خاں سمجھ گیا کہ اب سقوط دہلی یقینی ہے وہ بے خطا گولہ انداز مایوس ہو کر اسی رات واپس میوات اپنے گاؤں بڑمیں لوٹ آیا۔ ان غداروں میں بادشاہ کے سمدھی الٰہی بخش، وزیر حکیم احسن اللہ جیسے لوگ شامل تھے جن کو موقع پر پکڑے جانے کے باوجود بادشاہ ہر بار بچا لیتے تھے۔ اس بات نے کالے خاں جیسے بہادروں کو مایوس کر دیا۔ ہندوستان پر قبضہ کے بعد فرنگی حکمرانوں نے انگریز فوج کے افسر دلّی کے اسسٹنٹ کلکٹر کلیفورڈ کی کمان میں کالے خاں کی تلاش میں فوج کا ایک دستہ بھیجا۔ میوات کے قصبہ رائے سینا کے مقام پر آمنا سامنا ہوا۔ بے خبری میں کالے خاں کلیفورڈ کی گولیوں کا نشانہ بنا مگر زمین پر گرے ہوئے بہادر میو نے اس پر گولی چلائی جو اس کا دل چیرتی ہوئی نکل گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس لڑائی میں کالے خاں دھوکے سے مارا گیا مگر انگریزی فوج کا ایک سپاہی بھی بچ کر نہ جاسکا۔

میو قوم کو اس وطن پرستی کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی مکمل عملداری کے بعد انگریزوں نے میوات کو نشانے پر رکھ لیا۔ بریگیڈیر جنرل ساورس نے سونا اور تاؤڑو کے علاقوں میں کوئی تین ماہ تک قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس نے بابر کی طرح میوات میں آگ لگا کر سینکڑوں گاؤں کو خاکستر کیا۔ بابر سے پہلے بلبن کے ہاتھوں میوات کی تباہی تاریخ کا سنگین حادثہ ہے۔ ۵۷ء کی جنگ آزادی میں راسینہ، سوہنہ، تاؤڑو اور نوح میوات میں خصوصی مراکز تھے۔ جہاں انگریزوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندوستان پر قبضے کے بعد انگریز سرکار نے دوسرے قصبات کے ساتھ ان کی زمینیں بھی بحق سرکار ضبط کرلیں۔ مکمل عملداری کے بعد راسینہ اور اس کے متعلقہ دیہات نو نہرہ، محمد پور، سانپ کی ننگلی، ہریاہڑہ، بائی کی، ہر متھلہ وغیرہ جو میووں کی بسوہ داری میں تھے، بحق سرکار انگلشیہ ضبط کرلئے گئے۔ میو آج تک ان دیہات میں بطور مزارع کاشت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے دیہات کی زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ راسینہ کی بیشتر آبادی پاکستان چلی گئی مگر وہاں بھی ان کو زمینیں نہیں ملیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ سلوک ان لوگوں سے اپنوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے وطن کی آزادی کے لئے میدان جنگ میں لاکھوں جانیں قربان کیں، ان گنت لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ بعد میں انگریز سرکار نے کسی مصلحت کے تحت سارا ریکارڈ جلا دیا۔ پھانسی دیئے جانے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔

انتہائی شرم کا مقام ہے کہ جن غدار، وطن فروشوں کو غداری کے صلے میں جاگیریں ملیں وہ آزادی کے بعد بھی ان کے مالک رہے اور آج بھی ان کی اولادیں ان جاگیروں کی مالک ہیں اور جن وطن پرستوں کی جدی پشتی جاگیروں کو غاصب انگریز اپنے زر خریدوں کو دے گیا وہ آزادی کے بعد بھی ان کو لوٹائی نہ گئیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جن وطن پرستوں سے انگریزوں نے ان کی جائیدادیں چھینی تھیں، آزادی کی بعد نہ صرف یہ کہ ان کی جائیدادیں ان کو واپس کی جاتیں بلکہ ان کی قربانی کے صلے میں ان کو مزید انعام سے نوازا جاتا اور غداروں سے ان کے ناجائز آقاؤں کی بخشی گئی جائیدادیں چھین لی جاتیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں میوات کو پنجاب اور راجستھان میں بانٹ دیا گیا۔ بعد ازاں پنجاب کی جگہ ہریانہ نے لے لی۔ میوات کے علاقہ کو الور اور بھرت پور ریاستوں نیز گوڑ گانواں اور متھرا ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دلّی کے دیہی علاقے کے سینکڑوں دیہات کو اجاڑ دیا گیا۔ بعد ازاں وائسرائے ہاؤس کی تعمیر کے بہانے پانچ چھ گاؤں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان کی زرعی زمینوں پر آر کے پورم، ساؤتھ ایکس ٹینشن اور کناٹ پیلس کو بسا دیا گیا۔ ارد گرد کے سینکڑوں گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ میوں کو میوات سے باہر لے جا کر پھانسیاں دی گئیں اور بعد میں ریکارڈ جلا دیا گیا۔

میو مجاہدین کی بہادری کو انگریزوں نے تو تسلیم کیا ہے جنکے خلاف وہ لڑے مگر ہندوستانی مورخوں کو ان پر تحقیق اور تحریر کی توفیق نہ ہوئی۔ مجاہدین کے پورے کے پورے گاؤں جلا دیے گئے، زمینیں بحق سرکار ضبط کرلی گئیں جو آزادی کے بعد ان کو واپس نہیں کی گئیں۔ دونوں ملکوں میں مجاہدین آزادی کے ساتھ جو سلوک ہوا کیا وہ وطن فروشی اور غلامی کی ترغیب دینے کی طرح نہیں۔ دوبارہ تقسیم کیا جانے والا میوات آج تک تقسیم کے اس درد سے تڑپ رہا ہے۔

میو قوم کی جن قربانیوں کی تاریخ لکھنے کے لئے ہزاروں صفحات بھی کم پڑتے ہوں ان کو خورشید مصطفٰی زیدی اپنی کتاب جنگ آزادی 1857ء میں چند سطروں میں یوں بیان کر کے اپنا فرض ادا کر دیتا ہے: ”شہزادے (فیروزشاہ) کے ساتھی 6، اکتوبر کو آگرہ میں داخل ہوئے مگر چار دن بعد دہلی سے انگریزی فوجیں گریتہیڈ کی رہنمائی میں پہنچیں اور انقلابیوں کو منتشر ہونا پڑا۔ فتح پور سیکری کا سردار لال خاں میواتی بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادے سے آملا تھا۔ فتح پور سیکری کے میواتی کافی عرصہ تک بغاوت کرتے رہے۔ بالآخر فتح پور سیکری جلا دیا گیا اور 4 فروری 58ء کو آخری پارٹی نکالی جاسکی۔ میواتی تباہ کر دیے گئے“

9، ستمبر 57ء سقوط دہلی سے 4 فروری 58ء تک تقریباً 5 مہینے بنتے ہیں۔ گویا میو دہلی پر قبضہ ہونے کے بعد بھی 8،9 مہینے تک انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ کیونکہ آگرہ کے بعد بھی میو اندرون میوات انگریزوں سے برسر پیکار رہے۔ یہ معمولی بات نہیں۔ میو قوم کا جرم اپنی مٹی سے محبت اور غلامی سے نفرت ہے۔ جس کی سزا وہ آج تک پا رہی ہے۔

بھارت سرکار نے میوات کو ادھر ادھر کے علاقوں میں بانٹ کر اسے بے نشان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک چھوٹا سا علاقہ جسے ضلع میوات کا نام دے کر میو قوم کی اشک شوئی کی گئی تھی، سنا ہے مودی سرکار کو یہ نام بھی چبھنے لگا ہے اور میوات کی بجائے اسے کوئی اور نام دینے کی سازش کی جارہی ہے۔ الحذر اے چیرہ دستاں الحذر۔

عرب بہار جو خزاں سے اجڑ گئی

تحریر: آصف جیلانی

آٹھ سال ہوئے جب 17 دسمبر کو تیونس میں سڑک پر سبزی بیچنے والے نوجوان محمد بوعزیزی نے حکام کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر خود کو آگ لگالی تھی جس کے شعلوں نے عوام میں ایسی آگ بھڑکائی کہ 24 سال سے اقتدار پر قابض آمر زین العابدین بن علی کی حکومت کو آناً فاناً بھسم کر کے رکھ دیا۔ اس آگ کے شعلے تیونس تک محدود نہیں رہے بلکہ مصر سے یمن اور لیبیا اور مراکش سے بحرین تک آمر حکمرانوں کے خلاف جمہوری انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی جسے عرب بہار کا نام دیا گیا۔

تیونس میں تو اس بہار کے جمہوری پھول کی کونپلیں پھوٹیں جو اب بھی باد مخالف کی زد میں ہیں لیکن جن ملکوں میں عرب بہار کی لہر اٹھی تھی وہاں حالات پہلے سے بدتر ہیں۔ سب سے زیادہ عذاب مصر پر آیا جہاں ۳۷ سال سے اقتدار پر قابض حسنی مبارک سے نجات حاصل کرنے کے لئے لاکھوں افراد قاہرہ کے تحریر اسکویر میں جمہوریت کی شمع کی چاہت میں دیوانہ وار جمع ہو گئے اور سترہ روز کے اندر اندر حسنی مبارک کا تختہ الٹ دیا۔ فاتح عوام بہت خوش تھے کہ حسنی مبارک کے دور کے خاتمہ کے بعد ملک کی تاریخ میں پہلی بار عام انتخابات منعقد ہوئے۔ لیکن ان انتخابات میں اخوان المسلمین کی کامیابی اور محمد مرسی کے صدر منتخب ہونے پر واشنگٹن، تل ابیب اور ریاض تک ہل چل مچ گئی اور ان انتخابات کو رد کرنے کے لئے امریکا کی پشت پناہی اور ڈیڑھ ارب ڈالر کی امداد کے بل پر مصری فوج کے سربراہ جنرل عبدالفتاح السیسی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور منتخب صدر محمد مرسی کو پابند سلاسل کر کے ان کو مقدمات کے گھیرے میں لے لیا۔ سعودی عرب نے بھی اخوان المسلمین پر کاری وار کرنے کے لئے جنرل السیسی کو بارہ ارب ڈالر کی امداد دی۔ لوگوں نے دیکھا کہ پھر کس طرح اسرائیل، مصر کا دوست اور اتحادی بن کر ابھرا۔

عرب بہار نے سعودی عرب کا تو رخ نہیں کیا لیکن اس خطرہ کی پیش بینی کرتے ہوئے وہاں نوجوان ولی عہد محمد بن سلمان نے خواتین کو کار چلانے کی اجازت دے کر اور امریکی اور مغربی فلموں کے لئے سینما گھر کے دروازے کھول کر عرب بہار کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن استنبول کے سعودی قونصل خانہ میں صحافی جمال خشوگی کے بہیمانہ قتل نے اقتدار کے آسمان پر ولی عہد کے چڑھتے ہوئے سورج کو گہنا کے رکھ دیا۔ پھر امریکا کے سیاسی، فوجی اور اقتصادی چھاتے تلے اسرائیل سے قربت کی وجہ سے سعودی عرب کی متعبری کو سخت دھچکا پہنچا ہے۔

تیونس کو عرب بہار کی کامیابی پر فخر تھا اور جمہوری حکومتوں نے جمہوریت کو واقعی فروغ دیا لیکن یہ حکومتیں سنگین اقتصادی مسائل پر قابو پانے میں ناکام رہیں جس کے بعد تیونس میں جمہوری مستقبل خطرے میں نظر آتا ہے۔ دریں اثنا تیل کے پیاسے مغربی ممالک نے لیبیا میں عرب بہار کی آڑ لے کر معمر قذافی کا نہ صرف تختہ الٹ دیا بلکہ لیبیا کی سرزمین کو ان کے خون سے داغدار کر دیا۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو معمر قذافی کے مجوزہ افریقی مرکزی بینک اور نئی کرنسی کے منصوبے سے شدید خطرہ تھا کہ کہیں ڈالر کی بادشاہت نہ ختم ہو جائے۔ مغربی ممالک کو قذافی کے جوہری عزائم سے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ مغربی طاقتوں نے معمر قذافی کا تو خاتمہ کر دیا لیکن اس کے نتیجہ میں ملک دو حکومتوں اور دو پارلیمنٹوں میں بٹ گیا اور جنگجو سرداروں کی ولایتوں میں تقسیم ہو گیا۔

شام میں عرب بہار نے ہولناک خانہ جنگی کا رخ اختیار کر لیا جس میں امریکا، سعودی عرب سمیت اس کے اتحادی کود پڑے۔ یوں عرب بہار کے نام پر ہلاکت و تباہی اور بربادی کی ایسی آگ بھڑکا دی جو چار سال گذرنے کے بعد اب بھی بھڑک رہی ہے۔

ادھر بحرین میں عرب بہار کی جو لہر اٹھی وہ سعودی عرب نے اپنی فوجی امداد سے روک دی۔ فلسطینیوں کو امید تھی کہ عرب بہار ان کے دکھوں کا مداوا ثابت ہو گی خاص طور پر مصر کے انقلاب کے بعد انہیں توقع تھی کہ اسرائیل کے خلاف مزاحمت میں ان کے ہاتھ مضبوط ہوں گے لیکن مصر میں جنرل السیسی کی فوجی حکومت اور اس کی اسرائیل کے ساتھ قربت نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

عرب بہار کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ ایک تو اس تحریک کی کوئی مضبوط قیادت نہیں تھی اور پھر اس تحریک کے پاس وسائل کی کمی تھی۔ اس تحریک میں شامل لوگ صرف جمہوری نظام کی خواہش سے لیس تھے اور مقابلہ ان کا مالدار حکمرانوں کے فوجی اور مالی وسائل سے تھا۔ اسی کے ساتھ عرب حکمرانوں نے عرب بہار کو اپنی بقا کے لئے شدید خطرہ گردانا اور اس کو کچلنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کی اور مشترکہ اقدامات کئے۔

مراکش میں بادشاہ محمد V1 کے خلاف شورش کے خاتمہ کے لئے سخت گیر اقدامات اور سعودی عرب کی مالی امداد کے بل پر اقتصادی اصلاحات اور مراعات کارگر ثابت ہوئیں ۔ بہت سے مبصرین کے نزدیک عرب بہار گو خزاں سے اجڑ گئی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مکمل خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب بھی اس کی وقتی کامیابی جمہوریت پسند قوتوں کو وجدان بخشتی ہے۔ ایک سال کے دوران چار آمر حکمرانوں تیونس کے بن علی، مصر کے حسنی مبارک، لیبیا کے معمر قذافی اور یمن کے صلاح کی حکمرانی کا خاتمہ کچھ کم کامیابی نہیں تھی۔ پھر اس دوران کئی ملکوں میں انتخابات ہوئے اور کم سے کم تیونس میں جمہوریت کا قیام بھی عرب بہار کا مرہون منت ہے۔ عرب بہار نے یہ بات بھی باطل ثابت کر دی کہ عرب عوام اس قدر کاہل ہیں کہ ان سے کسی انقلابی اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ عرب بہار یکسر ختم ہو گئی ہے۔ اب بھی کئی ملکوں میں اس کی راکھ میں آگ سلگ رہی ہے اور مشرق وسطی میں وہ حالات برقرار ہیں جن کی وجہ سے آٹھ سال پہلے عرب بہار شروع ہوئی تھی۔ اب بھی آمر حکمران اور آمرانہ حکومتیں ہیں، عوام اقتصادی مصائب سے گذر رہے ہیں، عدل و انصاف کا فقدان ہے اور بدعنوانی عام ہے۔

شعبہ انٹرنیشنل

ضرورت ہے اٹھارہ فلسفیوں کی

تحریر: یاسر پیرزادہ

ایڈورڈ گبن ایک تاریخ دان تھا، رومن سلطنت کے عروج و زوال پر اُس نے ایک شاہکار کتاب لکھی، اِس کتاب کو بلاشبہ انگریزی میں تاریخ پر لکھی گئی سب سے مستند اور جاندار کتاب سمجھا جاتا ہے، گبن برطانوی پارلیمان کا رکن بھی تھا، یہ 1737 سے 1794 تک زندہ رہا۔ ڈیویڈ ہیوم کا زمانہ بھی اِس کے آس پاس کا ہے، یہ 1711 میں پیدا ہوا اور 1776 میں وفات پائی، اپنے کیریئر کے آغاز میں ہی اسے نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا مگر بعد میں یہ سنبھل گیا اور تاریخ انگلستان لکھ کر شہرت حاصل کی، تاہم اس کا بہترین کام تین جلدوں پر مشتمل مقالہ ہے جو اس نے انسانی فطرت پر لکھا، یہ اور بات ہے کہ اِس مقالے کو ہیوم کی زندگی میں کوئی خاص پذیرائی نہ مل سکی، ایڈنبرا شہر کے بیچوں بیچ اِس کا مجسمہ نصب ہے۔

ایمانول کانٹ سے تو ہم لوگ واقف ہی ہیں، چائے کی ہر چسکی کے ساتھ اِس فلسفی کے حوالے دیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ اِس کا فلسفہ خاصا دقیق تھا جس کا اندازہ عالی جناب کی مشہور زمانہ تصنیف "عقل محض کا محاسبہ" سے لگایا جا سکتا ہے، کانٹ نے اِس میں کہا تھا کہ انسان خدا اور کائنات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، اِن سوالات کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے جبکہ انسان کے پاس فقط طبعی قوانین کا علم ہے لہٰذا عقل محض سے مابعد الطبیعات تک رسائی ممکن نہیں۔ یہ بات موصوف نے کافی پیچیدہ انداز میں بیان کی ہے۔

جان لاک بھی ایک ہمہ جہت صلاحیتوں کا حامل شخص تھا، آکسفورڈ کا فارغ التحصیل تھا، طب کی تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں فلسفے پر ایسا مقالہ لکھ مارا جس نے ڈیکارٹ اور دوسرے دانشوروں کے چھکے چھڑا دیے، لاک کو برطانیہ سے فرار بھی ہونا پڑا کیونکہ اس پر الزام تھا کہ اُس نے بادشاہ کے خلاف سازش کی ہے مگر بعد میں بادشاہ کے تبدیل ہونے پر واپس بھی آ گیا۔

روسو کے نام سے بھی ہم سب کچھ نہ کچھ واقف ہی ہیں، روسو کی پیدائش جنیوا میں ہوئی اور جوانی غربت میں گذری، کسی نہ کسی طرح اُس نے اپنی تعلیم پوری کی اور پھر پیرس چلا آیا، سوشل کنٹرکٹ پر اُس کا مقالہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے، والٹیئر سے یہ متاثر تھا مگر بعد میں اپنا راستہ الگ کر لیا۔ والٹیئر ایک قانون دان کا بیٹا تھا، لاجواب لکھاری تھا، کئی موضوعات پر تسلسل کے ساتھ اُس نے لکھا، اس کی تحریر میں بہت کاٹ تھی جس کی وجہ سے اسے کچھ عرصہ قید اور بعد ازاں جلاوطنی کی زندگی بھی گذارنی پڑی، کاندید اُس کا شہرہ آفاق ناول ہے۔

اِن تمام فلسفیوں میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ تمام دانشور یورپ کی روشن فکری (Enlightenment) کی تحریک کے سرخیل تھے، اِس تحریک کا زمانہ سترھویں اور اٹھارویں صدی کا ہے، اِن دو سو برسوں میں یورپ میں ایسے فلسفی، دانشور، سائنس دان اور ریاضی دان اٹھے جنہوں نے ایک نئی سوچ کو پروان چڑھایا، حکومت، معاشرت، تعلیم، انصاف، اظہار رائے، مساوات اور انسانی آزادی کے نئے تصورات دیے جن سے پہلے یورپ نا آشنا تھا، ان تمام نظریات نے نہ صرف یورپ کو متاثر کیا بلکہ دنیا کو بھی ہمیشہ کے لیے تبدیل کر کے رکھ دیا، اِس تحریک کی بنیاد اِس بات پر تھی انسانی ترقی کا راز تنقیدی سوچ میں مضمر ہے نہ کہ اندھے اعتقاد اور توہمات میں۔

یہ لوگ جو روشن فکری کی تحریک کے روح رواں تھے، تعداد میں زیادہ نہیں، زیادہ سے زیادہ شاید اٹھارہ ہوں گے، مگر اِن میں والٹیئر، لاک، روسو، کانٹ، گبن اور ہیوم کے علاوہ نیوٹن، مونٹیسکیو اور کاندورسے جیسے عظیم مفکر بھی شامل تھے جن کی بدولت یہ تحریک اٹھی اور پورے یورپ کو تاریکی سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر گئی، اس کے ساتھ ہی صنعتی انقلاب برپا ہوگیا جس نے رہی سہی کسر پوری کر دی، پھر دو عظیم جنگوں کی تباہی بھی یورپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

روشن فکری کی تحریک کے بعض فلسفیوں کو اپنے نظریات کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں اور جلاوطنی کاٹنی پڑی بالکل اُسی طرح جیسے کچھ مسلمان مفکرین اور علما کو بھی گیارھویں بارھویں صدی میں کفر کے فتووں اور ظلم کا سامنا کرنا پڑا جن میں ابن رشد جیسا نام بھی شامل ہے۔ اس زمانے کے مسلمان فلسفی بھی ہمیں بالکل اسی طرح ایک لڑی میں پروئے نظر آتے ہیں جیسے سترھویں اٹھارویں صدی کے یورپین دانشور، ایک کے بعد دوسرا مفکر آیا، اُس نے اپنا فلسفہ پیش کیا، اُس پر رائے دی گئی پھر دوسرا فلسفی ظاہر ہوا جس نے ایک نئے فلسفے کی بنیاد رکھی اور یوں یہ سلسلہ چلتا گیا۔

مسلمانوں میں معتزلہ اور العشری نقطہ نظر بالکل اسی طریقے سے پروان چڑھے، ادھر یورپ میں روشن فکری کے زمانے میں ہیوم نے جب انسان کی آزادی کو مقدم قرار دیا تو اس سے نئے سوالات پیدا ہوئے جس کے نتیجے میں کانٹ کا

فلسفہ پیدا ہوا، والٹئیر اِس لڑی کا آخری مفکر تھا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں میں بھی فلسفے کی ایسی ہی توانا روایت تھی جس کا جنم بعد میں یورپ میں ہوا تو کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کا عروج زیادہ عرصہ برقرار نہ رہااور بغداد اور بصرہ جیسے شہر منگولوں نے آسانی سے فتح کر کے مسلمانوں کی علمیت کا سر کاٹ کر مینار بنا دیے جبکہ یورپ دو جنگیں بھگتا کر بھی دنیا کی امامت کر رہا ہے!

خاکسار کی رائے میں اِس کے دو مختصر ترین جواب ہیں، پہلا، مسلمان حکمران ایک وسیع وعریض سلطنت کے مالک تھے، عباسی خلیفہ کا سکہ جس پورے علاقے میں چلتا تھا وہ رقبے میں یورپ سے بھی زیادہ تھا، اگر کہیں کسی شخص کے نظریات حکمرانوں کو خطرناک لگتے تو اس کے لیے زمین تنگ کر دی جاتی اور یوں تحقیق و جستجو کی راہ مسدود ہو جاتی، دوسری طرف یورپ میں فلسفیوں کو یہ آزادی ملی کہ چھوٹی چھوٹی مملکتیں تھیں، والٹئیر پر فرانس کی زمین تنگ ہوئی تو وہ انگلستان آ گیا، روسو کو فرانس سے فرار ہونا پڑا مگر اسے جائے پناہ مل گئی، لاک انگلستان سے فرار ہو کر ہالینڈ آ گیا، یوں ان فلسفیوں کا کام چلتا رہا۔

دوسرا، تعلیم، تحقیق اور فلسفے میں اعلیٰ تخلیقات کرنا جنگی تدبیر کرنے اور فتوحات کرنے سے بالکل مختلف ہے، مسلمان بھلے منگولوں کے مقابلے زیادہ بہتر محقق تھے مگر جنگی میدان میں اُن کے آگے پانی بھرتے تھے، مسلمانوں کی عبرتناک شکست سے یہ بات ثابت بھی ہو گئی۔ دوسری طرف یورپ نے صرف روشن فکری کی تحریک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عقل کی بنیاد پر صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی اور پھر نئے ہتھیار ایجاد کر کے دنیا کو آگے لگا لیا۔ تیس کروڑ کی آبادی کے ہندوستان پر انگریزوں نے سو سال حکومت کی اور اِس دوران اُن کی فوج کی تعداد چالیس سے ستّر ہزار سے زیادہ نہیں ہوئی، اس کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ انگریزوں کے پاس جدید ہتھیار ہونا تھے۔

ہمیں بھی آج ایسے ہی اٹھارہ فلسفیوں کی ضرورت ہے جنہوں نے یورپ میں روشن فکر کی بنیاد رکھی، مگر اٹھارہ تو دور کی بات ہمارے پاس تو ایک شاید ایک بھی جینوئن دانشور نہیں، کچھ لوگ ضرور ہیں جو سنجیدہ علمی اور تحقیقی کام کر رہے ہیں مگر ظاہر ہے کہ اُن کا مقام وہ نہیں جو یورپ کے مفکرین کا تھا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو خود کو روسو اور والٹئیر سے کم نہیں سمجھتے مگر حقیقت میں یہ میڈ اِن چائنہ قسم کے دانشور ہیں جو چابی سے چلتے ہیں، جو اِن کی چابی بھرتا ہے یہ اُس کی زبان فر فر بولنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ خود کو آزاد منش بھی کہتے ہیں۔ ان دانشوروں کی موجودگی میں تحریک طعنہ زنی تو چل سکتی ہے، روشن فکری نہیں پنپ سکتی۔

MA Estates Management

Mr. Aziz Zaheer
The Director

47 London Road,
Tooting,
SW17 9JR

TEL: 0203 632 7395
MOB: 0741 172 5951
EMAIL: info@mamanagement.co.uk
Twitter: @MAEstatesLondon

شعبہ انٹرنیشنل

یہ انصاف ہے۔ کارلا فے ٹکر

لاہور انٹرنیشنل نیوز ڈیسک

کارلا فے ٹکر ایک طوائف کے یہاں پیدا ہوئی اس کی ولدیت کے خانے میں اس کی ماں ہی کا نام لکھا گیا۔ ماں کی گوناگوں ''مصروفیات'' کی باعث ٹکر کی تربیت کا مناسب بندوبست نہ ہوسکا۔ لہٰذا گندے ماحول اور عدم توجہ کے باعث 8 برس کی عمر میں اس نے سگریٹ نوشی شروع کر دی اور بمشکل دس برس کی عمر میں اس نے چرس پینا بھی شروع کر دی۔ 13 برس کی عمر میں جب وہ ابھی جوانی کے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہی تھی تو اس کی ماں اسے پہلی بار ''ساتھ'' لے کر ''باہر'' نکلی جس کے بعد وہ مسلسل 11 برس تک گناہ کی گھاٹیوں میں اترتی رہی اور ذلت کے صحراؤں میں ننگے پیر چلتی رہی۔

پھر 1983ء کی وہ رات آگئی جب اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر ایک جوڑے سے موٹرسائیکل چھیننے کی کوشش میں جوڑے کو ہلاک کر کے یہ دونوں فرار ہو گئے لیکن چند ہی ہفتوں میں پولیس نے انھیں گرفتار کرلیا۔ مقدمہ چلا اور ٹیکساس کی عدالت نے دونوں کو سزائے موت سنادی، جس کے بعد اپیلوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی دوران اس کا بوائے فرینڈ بیمار ہو کر جیل میں انتقال کر گیا جس کے بعد وہ تنہا رہ گئی۔

جیل حکام کو اس حادثے کا کوئی علم نہیں جس نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا، وہ لڑکی جو بات بات پر جیل انتظامیہ کو ننگی گالیاں دیا کرتی تھی وہ اچانک اپنا زیادہ تر وقت بائبل کے مطالعے میں گزارنے لگی، وہ نشئی عورت جو ہر وقت سگریٹ اور شراب کا مطالبہ کرتی رہتی تھی اب زیادہ تر روزے سے رہنے لگی اور اب اللہ اور مسیح کے سوا کسی چیز کا نام نہیں لیتی تھی۔ وہ ایک طوائف زادی اور قاتلہ کی جگہ مبلغہ بن گئی، ایک ایسی مبلغہ جس کے ایک ایک لفظ میں تاثیر تھی، پھر اس نے جیل ہی میں شادی کرلی اور تبلیغ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔

اس کی بدلی ہوئی شخصیت کی مہک جب جیل سے باہر پہنچی تو اخبارات کے رپورٹر جیل پر ٹوٹ پڑے اور امریکہ کی معاشرتی زندگی میں بھونچال آ گیا، یہاں تک کہ پوپ جان پال نے بھی زندگی میں پہلی بار عدالت میں کسی قاتلہ کی سزا معاف کرنے کی درخواست کر دی۔

سزائے موت سے پندرہ روز قبل جب لیری کنگ جیل میں ٹکر کا انٹرویو کرنے گیا تو دنیا نے سی این این پر ایک مطمئن اور مسرور چہرہ دیکھا جو پورے اطمینان سے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ لیری نے پوچھا ''تمھیں موت کا خوف محسوس نہیں ہوتا''۔ ٹکر نے مسکرا کر جواب دیا ''نہیں! اب مجھے صرف اور صرف موت کا انتظار ہے، میں جلد اپنے رب سے ملنا چاہتی ہوں، اپنی کھلی آنکھوں سے اس ہستی کا دیدار کرنا چاہتی ہوں جس نے میری ساری شخصیت ہی بدل دی''۔

انٹرویو نشر ہونے کے دوسرے روز پورے امریکہ نے کہا: ''نہیں یہ وہ ٹکر نہیں ہے جس نے دو معصوم شہریوں کو قتل کیا تھا، یہ تو ایک فرشتہ ہے جو صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے اور فرشتوں کو سزائے موت دینا انصاف نہیں ظلم ہے''۔ رحم کی اپیل ''ٹیکساس بورڈ آف پارڈن اینڈ پیرول'' کے سامنے پیش ہوئی۔ 18 رکنی بورڈ نے کیس سننے کی تاریخ دی تو 2 ممبروں نے چھٹی کی درخواست دیدی جبکہ باقی 16 ممبران نے سزا معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ بورڈ کا فیصلہ سن کر عوام سڑکوں پر آ گئے اور ٹکر کی درخواست لے کر ٹیکساس کے گورنر ''جارج بش'' کے پاس پہنچ گئے۔ امریکہ کے معزز ترین پادری جیسی جیکسن نے بھی ٹکر کی حمایت کر دی۔ گورنر نے درخواست سنی، جیسی جیکسن اور ہجوم سے اظہار ہمدردی کیا، لیکن آخر میں یہ کہہ کر معذرت کرلی: ''مجھے قانون پر عملدرآمد کرانے کے لئے گورنر بنایا گیا ہے، مجرموں کو معاف کرنے کے لئے نہیں، اگر یہ جرم فرشتے سے بھی سرزد ہوتا تو میں اسے بھی معاف نہ کرتا''۔

موت سے 2 روز قبل جب ٹکر کی رحم کی اپیل سپریم کورٹ پہنچی تو چیف جسٹس نے یہ فقرے لکھ کر درخواست واپس کر دی: ''اگر آج پوری دنیا کہے کہ یہ عورت کارلا فے ٹکر نہیں، ایک مقدس ہستی ہے تو بھی امریکن قانون میں اس کے لئے کوئی ریلیف نہیں ہے کیونکہ جس عورت نے قتل کرتے ہوئے دو بے گناہ شہریوں کو کوئی رعایت نہیں دی اسے دنیا کا کوئی منصف رعایت نہیں دے سکتا، ہم خدا سے پہلے ان دو لاشوں کے سامنے جوابدہ ہیں، جنہیں اس عورت نے ناحق مار دیا''۔

3 فروری 1998ء کی صبح پونے چھ بجے ٹیکساس کی ایک جیل میں 38 سالہ ''کارلا فے ٹکر'' کو زہریلا انجکشن لگا کر سزائے موت دیدی گئی۔

4 فروری کو جب سی این این سے کارلا فے ٹکر کی موت کی خبر نشر ہو رہی تھی تو میں نے اپنے ضمیر سے پوچھا کہ وہ کیا معجزہ ہے جو امریکہ جیسے سڑے ہوئے بیمار معاشرے کو زندہ رکھے ہوئے ہے تو حافظے میں حضرت علی کا قول زریں چمکنے لگا: ''معاشرے کفر کے ساتھ تو زندہ رہ سکتے ہیں لیکن ناانصافی کے ساتھ نہیں''۔

جو عدالتیں عوامی احتجاج یا حکمرانوں سے متاثر ہو کر اپنے فیصلے بدل دیں، تو وہ عدالتیں نہیں بادبانی کشتیاں ہوتی ہیں جن کی منزلوں کا تعین ملاح نہیں ہوا ئیں کرتی ہیں۔

شعبہ انٹرنیشنل

گنیز ورلڈ ریکارڈ حاصل کرنے والے منی ایچر آرٹسٹ احسن قیوم پنسل کے سکے پر ایک پوری دنیا سمو دیتے ہیں

تحریر: ظفر سید

’ریکارڈ تو بنتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں تو میری خواہش ہے کہ مستقبل میں اپنا ہی ریکارڈ توڑوں۔‘ یہ الفاظ حال ہی میں گنیز ورلڈ ریکارڈ قائم کرنے والے پاکستانی منی ایچر آرٹسٹ احسن قیوم کے ہیں جنھوں نے پنسل کے سکے پر چین کی 75 کڑیاں بنائی ہیں۔

ایک دن انسٹاگرام پر سکرول کرتے ہوئے میری نظر احسن قیوم کے فن پاروں پر پڑی۔ پنسل کے سکے پر نقوش؟ پہلی نظر میں ان کا آرٹ مجھے تو آنکھوں کا دھوکہ لگا۔

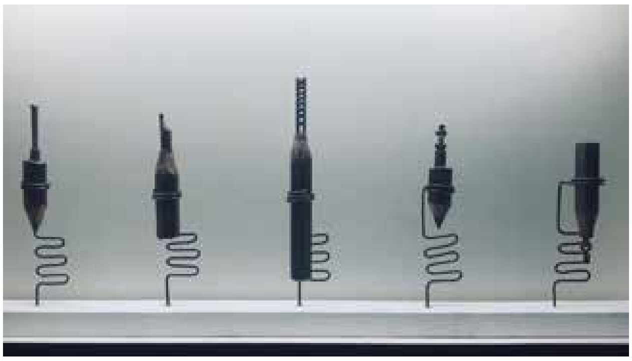

احسن سے میری ملاقات لاہور میں ان کے گھر پر ہوئی۔ ایک کمرے پر مشتمل گھر۔ دیوار پر گرافیٹی، اخبار کے تراشے، گٹار اور فریم کیے ہوئے فن پارے اور ان کے بیچ میں گنیز ورلڈ ریکارڈ جیتنے والا فن پارہ میڈل کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ گویا کمرے کا ہر حصہ ان کے آرٹسٹ ہونے کی عکاسی کر رہا تھا۔

دیوار پر منی ایچر آرٹ یا چھوٹے سائز کے نازک فن پارے دیکھ کر میں ایک بات تو سمجھ گئی کہ یہ دِکھنے میں چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ان کو بنانے کے لیے حوصلہ بڑا چاہیے۔ اور احسن سے مل کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسی حوصلے کا مظاہرہ انھوں نے اپنی نجی زندگی میں بھی کیا ہے۔

حالات نے انھیں اپنے آبائی شہر گجرانوالہ کو خیر باد کہنے پر مجبور کیا تو وہ لاہور آ گئے اور جوتوں کی فیکٹری میں سات ہزار روپے کی ملازمت کرنے لگے۔

احسن کے شوق کا آغاز تو بچپن میں ہی ہو گیا تھا جب ترکھانوں کے گھر چلے جانے کے بعد وہ ان کی بچی کھچی لکڑیوں کو اٹھا لیتے اور تراشا کرتے۔

ملازمت کے ساتھ احسن نے گرافک ڈیزائننگ کی تعلیم شروع کی اور جلد ہی اسے اپنا کریئر بھی بنا لیا۔ لیکن آرٹ تخلیق کرنے کے شوق میں وہ اب بھی رات گئے تک جاگتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں ’لوگ تو مجھے آرٹ کا دیوانہ کہتے ہیں کہ پاگل ہو گیا ہے اس کے پیچھے۔‘

لیکن احسن کے بقول ان کے شوق کو سمت سنہ 2015 میں ملی جب ان کے ایک دوست نے انھیں روسی منی ایچر آرٹسٹ سلاوات فدائی کے فن پاروں کی تصاویر دکھائیں اور کہا یہ تم بھی کر سکتے ہو۔

’میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور فوراً ہی بلیڈ سے پنسل تراشنا شروع کر دیا۔‘

سنہ 2019 کے آغاز میں ہی احسن قیوم تہیہ کر چکے تھے کہ وہ پنسل کے سکے پر 75 کڑیاں جوڑ کر انڈین آرٹسٹ کا 50 کڑیوں پر مشتمل ورلڈ ریکارڈ توڑیں گے۔

اس دوران ایک اور انڈین منی ایچر آرٹسٹ نے 58 کڑیاں جوڑ کر نیا گنیز ورلڈ ریکارڈ قائم کر لیا مگر احسن تو اس سے کہیں آگے کا سوچ کر اپنا ریکارڈ قائم کرنے میں مصروف تھے۔

گنیز ریکارڈ جیتنے والا فن پارہ

جب گنیز ورلڈ ریکارڈ کا ٹائٹل جتانے والے فن پارے کے متعلق بات ہوئی تو احسن نے بتایا کہ اس فن پارے کو مکمل کرنے میں ایک ماہ لگا اور اسے انھوں نے ایک ہی بار میں بنایا۔ 75 کڑیوں پر مشتمل چین کی ایک کڑی پر ڈیڑھ گھنٹہ لگا اور کُل ملا کر 120 گھنٹے لگے۔

’یہ فن پارہ میرے دل کے قریب اس لیے ہے کیونکہ اس نے مجھے بہت زیادہ صابر بنایا اور ٹائٹل جتوایا۔‘

ورلڈ ریکارڈ بنانے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟

ورلڈ ریکارڈ قائم کرنے کے لیے کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اس بارے میں

احسن کا کہنا تھا کہ ’یہ سب چیزیں اسی طرح ہوسکتی ہیں اگر آپ اپنے کام میں محو ہوجائیں اور اس کو اپنی دنیا بنالیں جس (کام) میں آپ کی دلچسپی ہے۔‘

ٹیلنٹ ہو تو چھپائے نہیں چھپتا۔ اس بات پر زور دیتے ہوئے احسن نے کہا ’میں نے چھ روپے کی پنسل پر ورلڈ ریکارڈ توڑا۔۔۔ ایک سادہ سی چھ روپے کی پنسل پر۔ آپ اپنی صلاحیت کسی بھی چیز کے ذریعے باہر لا سکتے ہیں۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ چیز کتنی مہنگی ہے یا سستی۔‘

’بطور آرٹسٹ جب میں چھوٹی سے دنیا سے نکل کر باہر جاتا ہوں تو بڑی بڑی عمارتیں مجھے اپنے ان خوابوں کی طرح نظر آتی ہیں جنھیں میں پانا چاہتا ہوں کیونکہ انسان کو ہمیشہ بڑا سوچنا چاہیے، چھوٹی سوچ نہیں رکھنی چاہیے۔‘

گنیز ورلڈ ریکارڈ بنانے کا طریقہ کار کیا ہے؟

احسن کہتے ہیں ’اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے اندر صلاحیت ہے تو آپ گنیز ورلڈ ریکارڈ کی ویب سائٹ پر جائیں۔ وہاں پر اپنا اکاؤنٹ بنائیں اور درخواست جمع کروائیں۔ دو طرح کی درخواستیں ہوتی ہیں، ریکارڈ توڑنے کی اور ریکارڈ قائم کرنے کی۔‘

’کافی طویل سلسلہ ہوتا ہے اور اس کے لیے آپ کو تقریباً چھ ماہ درکار ہوتے ہیں۔ پہلے آپ کی درخواست دیکھی جاتی ہے اور اگر درخواست منظور کر لی جائے تو آپ کو شواہد جمع کروانے پڑتے ہیں جو ریکارڈ بناتے وقت کی تصاویر، ویڈیوز اور اس بارے میں شائع کالم وغیرہ پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔‘

شواہد کی مضبوطی پر زور دیتے ہوئے احسن نے بتایا کہ ’آپ کو اپنا ریکارڈ قائم کرنے یا توڑنے کے بارے میں آزاد گواہان کے بیانیے بھی چاہیے جن کا آپ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ آپ کے شواہد اتنے مضبوط ہونے چاہیے کہ کمیٹی قائل ہوجائے ورنہ آپ کی درخواست خارج ہوسکتی ہے۔‘

آخر پنسل پر فن پارے بنتے کیسے ہیں؟

پنسلوں سے بھرے میز پر تیز روشنی جلا کر ایک پنسل تراشتے ہوئے احسن کہنے لگے کہ سب سے اہم چیز آئیڈیا سلیکشن ہے کہ سکے پر کیا بنایا جائے۔

نقش کا آئیڈیا تلاش کرنے کے لیے وہ سوشل میڈیا ایپ انسٹاگرام اور پنٹریسٹ کا استعمال کرتے ہیں۔

بمشکل نظر آنے والے ملی میٹر کے گرافائیٹ سکے پر احسن کو صرف ایک بلیڈ کی مدد سے نقوش بناتے دیکھ کر دماغ دنگ رہ جاتا ہے۔ ان کے بقول یہ بہت باریکی کا کام ہے اور بیرون ممالک میں آرٹسٹ میگنیفائر یا مائکروسکوپ کا استعمال کرتے ہیں لیکن وہ کسی چیز کا سہارا نہیں لیتے۔

’پنسل کی نوک پر فن پارہ تراشنے میں کم از کم چھ گھنٹے درکار ہوتے ہیں اور بعض اوقات ہفتے اور مہینے بھی لگ جاتے ہیں۔‘

ابھی تک احسن نے 30 سے 40 فن پارے بنائے ہیں جن میں سے چار پانچ بار انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ’جب آپ ایک چیز میں فیل ہوجائیں تو اپنے دماغ کو سکون دیں اور اس دوران کچھ اور کرلیں۔‘

پاکستان میں منی ایچر آرٹ کا حال اور مستقبل

اس بات سے منہ نہیں پھیرا جا سکتا کہ آج بھی پاکستان میں آرٹ کو خاص پذیرائی حاصل نہیں ہے۔ اس بارے میں احسن کا کہنا ہے کہ جب وہ کسی کو بتاتے ہیں کہ وہ منی ایچر آرٹسٹ ہیں تو لوگوں کو تب تک سمجھ نہیں آتی جب تک کہ وہ انھیں کچھ دکھا نہ دیں۔

معاشرے میں آرٹ اور آرٹسٹ کو لے کر پائے جانے والے منفی رویے کے بارے میں احسن کہتے ہیں ’میرے کچھ دوستوں نے میرا مذاق بھی اڑایا کہ تم ایک چیز پر چھ چھ گھنٹے لگاتے ہو، اس سے تمھاری تنخواہ تو نہیں آرہی۔‘

’مگر ہر چیز پیسے کے لیے نہیں کی جاتی، کچھ چیزیں دل کو سکون دیتی ہیں۔ آج میری کامیابی ان کی باتوں اور سوالوں کا جواب ہے۔‘

پاکستان میں منی ایچر آرٹ کے مستقبل کے بارے میں احسن کا کہنا تھا کہ یہاں لوگوں کو سمجھ نہیں ہے کہ یہ کس قسم کا آرٹ ہے اس لیے انھیں پیسے کے لحاظ سے منی ایچر آرٹ کا کوئی خاص مستقبل نظر نہیں آتا۔

ہر جمعے کی طرح اس جمعے بھی احسن والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کرنے کے لیے گئے مگر اس بار ایک خوشخبری کے ساتھ۔

’پہلا کام ہی میں نے یہ کیا کہ امی ابو کی قبروں پر گیا اور ان سے شیئر کیا۔ کاش اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ان کے لیے یہ سب سے فخر کی بات ہوتی۔۔۔ شاید وہ اب بھی دیکھ رہے ہوں گے۔‘

شعبہ انٹرنیشنل

"ایتھوپیا" بھی ہم سے آگے نکل گیا!

تحریر: علی احمد ڈھلوں

افریقی ملک ایتھوپیا کا نام سنتے ہی ایک ایسے ملک کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جو دو جنگ وجدل اور قحط سے تباہ حال چلا آرہا تھا۔ اس کی آبادی کوئی دس کروڑ کے لگ بھگ ہے جس میں ایک تہائی مسلمان ہیں۔

پاکستان کے عام انتخابات سے 3 ماہ قبل اپریل 2018 میں ایتھوپیا میں بھی انتخابات ہوئے جس میں وزیرِ اعظم ابی احمد نے کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے وزیر اعظم منتخب ہوتے ہی تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے اور میڈیا کو مکمل آزادی سے ہمکنار کیا۔

ایتھوپیا کے وزیرِ اعظم ابی احمد

انھوں نے اُن لوگوں سے معافی مانگی جن پر رِیاست کئی عشروں سے ظلم ڈھاتی چلی آرہی تھی۔ مختصر سی مدت میں سول سوسائٹی فعال ہوگئی ہے۔ اِس کے علاوہ انھوں نے اپنے ہمسایہ ملک اریٹیریا سے تعلقات بحال کیے جس کے ساتھ جنگ میں ایک لاکھ افراد موت کی گھاٹ اُتر چکے تھے۔ مسلمان باپ اور عیسائی ماں کے بیٹے ابی احمد مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دے رہے ہیں۔ اِن عظیم کارناموں پر انھیں گزشتہ دنوں امن کا نوبیل انعام دیا گیا ہے۔ اس نوبل انعام کی مالیت 90 لاکھ سویڈیشن کراؤن یا نو لاکھ امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ یہ انعام انھیں 10 دسمبر کو ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں دیا جائے گا۔

ایتھوپیا کی تاریخ بڑی ہنگامہ خیز اور درد ناک ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایتھوپیا کی مزاحمتی تحریک نے انگریزوں کی مدد سے اٹلی کو باہر نکال کر ایک آزاد ملک بنایا۔ اس کے بعد کی تاریخ کے بیشتر ادوار میں اس ملک کو بدترین قدرتی آفات، بدترین قحط سالیوں، بدترین آمریتوں، پڑوسیوں کے ساتھ طویل اور خونی لڑائیوں، بھوک ننگ اور ذلت کا سامنا رہا۔ ان حالات و واقعات کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کے فاقہ زدہ ممالک میں ہوتا تھا، مگر سن 2000 کے بعد صورت حال تیزی سے بدلنے لگی۔ ایتھوپیا دنیا کا تیسرا غریب ترین ملک تھا۔ پھر یہاں پر جو تبدیلی آئی وہ حیرت انگیز تھی۔

آئی ایم ایف کی ایک رپورٹ کے مطابق 2000 سے لے کر 2016 تک ایتھوپیا دنیا میں تیز ترین رفتار سے ترقی کرنے والے ممالک میں سے ایک تھا۔ جہاں تک مستقبل میں ترقی کی رفتار کا تعلق ہے تو آئی ایم ایف کے اندازے کے مطابق 2022 تک ایتھوپیا کا جی ڈی پی چھ اعشاریہ دو کی شرح سے بڑھے گا۔ اور اگر یہ رفتار برقرار رہی تو مستقبل قریب میں ایتھوپیا ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے گا۔ یہ باتیں جان کر شاید ہمیں تکلیف پہنچے کہ جس ملک کے بارے میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہماری زندگی میں کبھی وہ قحط سے بھی نکل سکے گا یا نہیں، آج اُس کی جی ڈی پی 6.5 اور پاکستان کی جی ڈی پی 3.3 ہے۔ بقول شاعر

فضا نہیں ہے ابھی کھل کے بات کرنے کی
بدل رہے ہیں زمانہ کو ہم اشاروں سے

اور یہ کالم شاید قارئین پر ناگوار گزرے کہ ہم (پاکستانی) اتنے گئے گزرے نہیں کہ ایتھوپیا جیسے بھوکے ننگے ملکوں کے تجربات کے محتاج ہوں۔ لیکن پیشگی معذرت کے ساتھ ہم ایتھوپیا کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جن شعبوں میں ہم یہ استفادہ کر سکتے ہیں ان میں ایک تعلیم ہے۔ ایتھوپیا نے کئی برس قبل یہ اعلان کر کے دنیا کو حیران کر دیا تھا کہ ایتھوپیا اپنے کل بجٹ کا پچیس فیصد تعلیم پر خرچ کرے گا اور اس بجٹ کا نصف پرائمری تعلیم پر خرچ کیا جائے گا۔ اس موضوع پر عالمی بینک نے ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق سال دو ہزار پانچ سے دو ہزار سترہ تک ملک میں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلوں کی شرح میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔

ایتھوپیا نے جب تعلیم میں انقلاب کے عزم کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت پورے

ملک میں کل ملا کر آٹھ سرکاری اعلیٰ تعلیمی ادارے تھے۔ 2017 تک ان کی تعداد چھتیس ہو چکی تھی۔حکومت نے اعلیٰ تعلیم کی جو پالیسی اپنائی وہ ستر تیس کے نام سے مشہور ہوئی۔ 7030 کا مطلب یہ تھا کہ ستر فیصد طلبا کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دی جائے گی، اور باقی تیس فیصد کو سماجی سائنس اور فنون عامہ یا علم و ادب پڑھایا جائے گا۔ یہ پالیسی عالمی ضروریات کے تناظر میں بنائی گئی تھی، چنانچہ اس پالیسی نے حیرت انگیز اور فوری نتائج دیے۔

ایتھوپیا کے وزیر اعظم ابی احمد نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا بلکہ ٹھوس معاشی پالیسی ترتیب دے دی ہے۔ابی احمد نے اقتدار سنبھالنے کے بعد نجکاری کا اعلان کیا۔ ایتھوپیا کے سب سے بڑے چار کاروبار ایتھوپیا ایئرلائن، ٹیلی کام، الیکٹرک پاور کارپوریشن، شپنگ اینڈ لاجسٹکس اور انڈسٹریل پارکس کی جزوی نجکاری کی گئی۔ ساٹھ ملین لینڈ لائن اور موبائل فون کنکشن والے ملک میں ٹیلی کام سیکٹر میں مزید دو نئے لائسنس دیے گئے۔

سرمایہ کاری کے مواقع بڑھانے کے لیے ایتھوپیا میں چین کی طرز پر انڈسٹریل پارکس بنائے گئے ہیں۔ پانچ انڈسٹریل پارکس حکومتی ملکیت ہیں جب کہ دو نجی شعبے میں ہیں۔ وزیر اعظم ابی احمد 2025 تک 30 انڈسٹریل پارکس بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ ملازمتوں کے مواقع بڑھائے جائیں اور ملکی پیداوار پانچ فیصد سے بڑھا کر بائیس فیصد تک لائی جائے۔ کئی بڑے کاروباری برانڈز پہلے ہی ایتھوپیا پہنچ چکے ہیں۔

ابی احمد علی کی پالیسیوں نے نتائج دینا شروع کر دیے ہیں۔ ورلڈ بینک نے ڈائریکٹ بجٹ سپورٹ کے لیے ایک اعشاریہ دو ارب ڈالر دیے ہیں جب کہ متحدہ عرب امارات کا ایک تعمیراتی گروپ ایتھوپیا میں دو ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کو ہے۔ یہ سرمایہ کاری چار ہزار گھروں کی تعمیر میں کی جائے گی۔ نجکاری کا عمل تیز ہوتے ہی مزید بیرونی سرمایہ کاری ایتھوپیا کا رخ کرے گی۔

یہ سارے کام ایک طرف مگر جو بات دل کو لگی وہ وہاں کے عوام کا طرز عمل ہے، وہاں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جس نے 200 سالوں سے موجود خانہ جنگی میں اپنے کسی پیارے کو نہ کھویا ہو، لیکن وہاں کے عوام نے ''تبدیلی'' میں حکومت کا بھرپور ساتھ دیا، وہاں لگ بھگ 19 سال سے تبدیلی کا سفر جاری ہے، جس کا ثمر آج عوام کو ملنا شروع ہو گیا ہے۔

وہاں کے عوام نے حکومت کا ہر سطح پر ساتھ دیا، مثلاً اگر حکومت نے پودے لگانے کی بات کی تو ایتھوپیا کے عوام نے 12 گھنٹوں میں 35 کروڑ پودے لگا کر کئی ممالک کے ریکارڈ کو توڑ دیا۔ درخت لگانے سے کیا کیا معجزے ہو سکتے ہیں؟ ہم سب یہ جانتے ہیں۔ ہم ہر سال دس بلین ٹن سے زائد کاربن ہوا میں پھینکتے ہیں اور ایک تحقیق کے مطابق اگر دنیا میں پانچ سو ارب درخت لگائے جائیں تو فضا سے کل کاربن کا ایک چوتھائی کم ہو سکتا ہے۔

اس کے برعکس ہم عوام کچھ کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں، اگر کوئی قائد ہمیں یہ کہتا ہے کہ فلاں کاروبار کر لو اس سے ملک کو فائدہ ہوگا، ہم اُس کا تمسخر اُڑاتے ہیں۔ تبھی آج ہماری ترقی کی شرح شرمناک حد تک نیچے آ چکی ہے جب کہ نائیجیریا اور بنگلہ دیش جیسے ممالک ہم سے کئی گنا آگے نکل چکے ہیں۔ ہمارے زرمبادلہ کے ذخائر 10 ارب ڈالر کے آس پاس ہیں جب کہ بنگلہ دیش 40 ارب ڈالر کو چھو رہا ہے۔

پاکستان زرعی ملک ہے اور کپاس بڑی فصل تصور کی جاتی ہے اس کے باوجود بنگلہ دیش نے ٹیکسٹائل انڈسٹری اور برآمدات کے میدان میں پاکستان کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اسی ہفتے ورلڈ اکنامک فورم نے عالمی مسابقتی رپورٹ جاری کی ہے جس کے مطابق پاکستان کی معیشت جنوبی ایشیا میں دیگر ممالک کے مقابلے میں تنزلی کا شکار رہی ہے جب کہ عالمی سطح پر بھی پاکستان ایک سال کے دوران مزید تین درجے نیچے چلا گیا ہے۔

لہٰذا آج عمران خان بھی ابی احمد کی جگہ لے سکتے ہیں لیکن لگتا یہی ہے کہ اُن کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، کس نے باندھے ہیں یہ تو وہی بتا سکتے ہیں مگر جس طرح وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کا مقدمہ پیش کر کے عالمی لیڈر کے طور پر اُبھرے ہیں وہ یقیناً پاکستان میں بھی بولڈ اقدامات کر کے اگلے نوبل انعام کے حقدار قرار پا سکتے ہیں لیکن اُس کے لئے ایتھوپین عوام کی طرح پاکستانی عوام کو بھی حکمرانوں کا ساتھ دینا ہوگا!

❁❁❁

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لئے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کا پی رائٹ ہیں۔ بلااجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

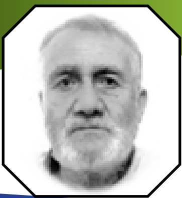

بائیومیٹرک کیا ہے اور کیا نہیں ہے

تحریر: سعد اللہ جان برق

کسی کا قول ہے اور جب ''قول'' ہے تو کسی بزرگ کا ہی ہوگا اور جب کسی بزرگ کا ہے تو پھر ''زرین'' بھی ہوگا کیونکہ پرانے زمانوں میں ''زر'' نہایت ہی سستا تھا۔

کسی بزرگ کا قول زرین یہ ہے کہ علم سمندر ہے، اس میں کہیں بھی کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے جو چاہو اس میں مل سکتا ہے، اس لیے اتنا عرصہ اس ناہنجار نابکار سرابرہ مکار دنیا میں بغیر کسی جرم کے قید بامشقت گزارنے کے باوجود اب بھی ایسی بہت ساری چیزیں ہیں جو ہمارے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں مثلاً ہم نے میٹرک سنا تھا، انڈر میٹرک سنا تھا، بابو میٹرک سنا تھا، ناپ تول کا میٹرک یعنی اعشاری نظام سنا تھا لیکن یہ ''بائیومیٹرک'' نہیں سنا تھا یا یوں کہیے کہ ان دونوں یعنی ''بائیو'' اور ''میٹرک'' کو یوں ایک ساتھ نہیں سنا تھا۔

دونوں کو الگ الگ دیکھتے اور سنتے آئے تھے مثلاً بائیوکیمک سنا تھا، بائیو گیس سنا تھا، بائیوٹک سنا تھا، بائیو گرافی سے بھی واقف تھے حتیٰ کہ بائیو کھاد اور بائیو آب کے بارے میں بھی سنا تھا بلکہ ان سب کی ''مادر محترمہ'' بائیولوجی سے بھی کسی حد تک شناسائی تھی لیکن یہ ''بائیومیٹرک'' بہت سارے لوگوں سے پوچھا بھی کہ کہاں سے آئی یہ جلیبی بائی لیکن کسی نے بتا کر نہ دیا، اصل میں سارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں' لکھے تو بہت ہیں لیکن کچھ زیادہ پڑھے نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے تمام مقامات جن پر درس گاہ کی تہمت لگائی جاسکتی ہے۔ ہم کبھی نہیں گئے۔ جانے کی حد تک گئے ضرور ہیں لیکن ہماری قسمت ہمارے ساتھ ہوتی تھی اس لیے کوئی نہ کوئی حادثہ' وقوعہ یا لفڑا ایسا ہو جاتا تھا جس کے نتیجے میں ہمارے ساتھ وہی کچھ پیش آتا جو ہمارے جد امجد حضرت آدم اور اس کے بعد ہمارے پیرومرشد حضرت غالب کے ساتھ پیش آیا تھا یعنی

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ویسے اس بات پر ہمیں تھوڑا سا فخر بھی ہے کہ کسی اور بات میں نہ سہی کم از کم ''بے آبروئی'' میں تو ہم اپنے جد امجد اور پیرومرشد پر گئے ہیں' وہ مقامات جن پر درس گاہ ہونے کی تہمتیں لگی ہوئی تھیں یا لگائی جاسکتی ہیں، وہاں ہماری بے آبروئی کا تعلق اصل میں ستاروں سے ہے کیوں کہ ایسے مقامات پر جب بھی ہم جاتے کوئی نہ کوئی ایسی انہونی ہو جاتی جس کے نتیجے میں ہماری ان سے نہ نبھ پاتی اور ہم گھر لوٹ آتے تھے، زیادہ تر اور شدید اختلافات درسی کتب لکھنے والوں سے ہوتے تھے کیوں کہ وہ اکثر ''ترکی زبان'' میں لکھے ہوتے اور ہم

زبان یار من ترکی و من ترکی نہ می دانم

کہتے ہوئے نہایت ہی ''آبرو'' کے ساتھ وہاں سے نکل آتے ''آب رو'' یعنی چہرے پر پانی تو جانتے ہی ہوں گے چنانچہ ہمارا سارا تعلیمی عرصہ لگ بھگ انیس گھنٹے بنتا ہے جو کل ملا کر نو درس گاہوں پر تقسیم کیا جائے سوائے ایک کے جہاں ہم نے پورے نو گھنٹے گزارے تھے کیوں کہ استاد چھٹی پر تھا، ظاہر ہے کہ اندریں حالات ہمارا پڑھنے کا ریکارڈ تو ناگفتہ بہ حد تک کمزور بلکہ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے البتہ لکھنے میں ہم ہمیشہ ٹاپ کرتے تھے۔

کیوں کہ اتنے تعلیمی عرصے میں ہم نے دیواروں پر اپنے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں اچھے خاصے تحریری کارنامے کیے اور مسلسل پریکٹس سے اتنی قابلیت بہم پہنچائی کہ اب وہی کام کاغذ پر بھی کر سکتے ہیں، ایسے میں جب ''بائیو میٹرک'' جیسے مشکل الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے تو پریشانی تو ہوتی ہی ہے لیکن خدا ہمارے پڑھنے والوں کو سلامت رکھے کہ ہم اپنی پریشانی کو شیئر کر لیتے ہیں۔

ہماری تو جہاں تک اس ناقابل بھروسہ سمجھ میں آیا ہے کہ بائیو اور میٹرک کو الگ الگ کر دیا جائے تو بائیو کا مطلب ہوا اور میٹرک کا مطلب تو سوائے ''میٹرک'' کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا، آپ کا کیا خیال ہے، ہم آپ کو بالکل بھی تکلیف نہ دیتے اگر ہمیں لغات اور ڈکشنریوں سے سخت پرخاش نہ ہوتی کیوں کہ یہ دنیا کی وہ واحد قسم کی کتابیں ہوتی ہیں جن میں گالیاں بھی لکھی ہوئی ہوتی ہیں، آپ ہی بتائیں ایسی کتابوں کو بھلا کوئی پسند کرسکتا۔

یہ تو سراسر غیر شریفانہ بات ہے کہ ان گالیوں کی باقاعدہ تشریح بھی کی جاتی ہے اور یہ لوگ اپنے آپ کو عالم و فاضل کہہ کر اتنا بھی نہیں جانتے کہ گالیاں تحریری شکل میں بالکل بھی بے معنی ہو جاتی ہیں ''گالی'' صرف زبانی کلامی ہی زیادہ موثر ہوتی ہے چنانچہ ہم لغت اور ڈکشنری کو گھر میں رکھنا تو کیا دس فٹ بانس سے چھونا بھی پسند نہیں کرتے ورنہ ''بائیو میٹرک'' کو سمجھنے کے لیے اپنے پڑھنے والوں کو کیوں تکلیف دیتے لیکن یہ بھی مت سمجھیے گا کہ ہم نے آپ کو تکلیف دینے سے پہلے کسی اور سے رجوع نہیں کیا، علامہ بریانی عرف برڈ فلو نے تو صاف انکار کرتے ہوئے ہمیں الٹا مطعون کیا کہ اس قسم کی خرافات پر دھیان دینے کے بجائے اپنا وقت دو رکعت نفلوں اور ذکر اذکار میں صرف کرتے، البتہ چشم گل چشم عرف قہر خداوندی سابق ڈینگی مچھر نے اچھی خاصی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور ایک بڑا ہی قیمتی مشورہ بھی دیا جو زرین تو نہیں لیکن خاکین کا مستحق ضرور ہے۔

بولا، یہ جو اخباروں میں روزانہ ''معلومات تک رسائی'' کے ڈنکے بج رہے ہیں، تم ان معلومات والوں سے کیوں نہیں معلوم کرتے لیکن بے چارے کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے کسی ''رستم'' سے رجوع کرنا ہوگا جو ان ہفت خوانوں کو سر کر سکے جو ''سرکاری'' اور ''معلومات'' دونوں کے گرد بنے ہوئے ہیں، اس لیے قارئین اب آپ ہی کا آسرا ہے کہ یہ ''بائیومیٹرک'' کیا ہے، ٹپ ہم ضرور دے سکتے ہیں، اس کا جائز یا ناجائز تعلق بلدیاتی انتخابات سے ہے بلکہ ایک اور ٹپ یہ لے لیجیے کہ اب بلدیاتی انتخابات بائیومیٹرک سے نہیں ہوں گے لیکن پھر بھی اگر بائیومیٹرک سے نہیں ہو رہے ہیں تو ''کیا'' نہیں ہوگا کیوں کہ یہ بھی آج تک پردہ راز میں ہے کہ انتخابات چاہے کسی قسم کے بھی ہوں اس سے کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا ہے۔

شعبہ انٹرنیشنل

چند انوکھے ملک

تحریر: مرزا ظفر بیگ

ہم سبھی نے فرانس، اسپین اور اٹلی کے بارے میں ضرور سنا ہوگا اور بہت سے وہاں جانے اور وہاں رہنے کے خواب بھی دیکھتے ہوں گے، مگر یہاں ہم کچھ ایسے ملکوں کی بات کر رہے ہیں جن سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے، لیکن اگر لوگ وہاں نہیں گئے تو پھر وہ بہت کچھ دیکھنے سے محروم ہیں، کیوں کہ ان انوکھے ملکوں میں جانے کے بعد وہاں کا انوکھا اور بے مثال کلچر ان کی آنکھیں کھول دے گا اور وہاں کے جغرافیائی تجربات بھی سب کو حیران کر سکتے ہیں۔ آیئے ان ملکوں کی باتیں کرتے ہیں:

☆Vanuatu:

Vanuatu جنوبی بحرالکاہل میں واقع ہے۔ یہ کم و بیش 3,500 سال پہلے سیٹ ہوا تھا اور بعد میں معروف تاریخی مہم جو جیمس کک نے 1774 میں اس کا دورہ کیا تھا۔ اگر آپ اس جزیرے کا سفر کرنا چاہتے ہیں تو آپ اس کے حسین و جمیل ساحل اور اس کی آبشاریں کھوج سکتے ہیں، اس کے علاوہ آپ یہاں پانی میں غرقاب بحری جہازوں کو اسکوبا ڈائیونگ کے ذریعے دیکھ اور کھوج سکتے ہیں۔ آپ یہاں کے ماؤنٹ یاسر پر کوہ پیمائی بھی کر سکتے ہیں اور یہاں کے ریسٹورنٹس کے خوش ذائقہ کھانوں سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس جزیرے کے سفر کا بہترین وقت مئی اور اکتوبر ہیں۔ یہاں ان دونوں مہینوں کے دوران متعدد فیسٹیول بھی منعقد ہوتے ہیں اور کئی اسپورٹنگ مقابلے بھی۔

☆Kiribati:

بحرالکاہل میں ہی واقع Kiribati کی آبادی ایک لاکھ افراد سے بھی زیادہ ہے۔ Kiribati اپنے جنگِ عظیم دوم کے آثار کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو یہاں کی سیر و تفریح کر کے دنیا بھر میں فشنگ یا مچھلی کے شکار کے علاوہ متعدد کلچرل تجربات بھی حاصل ہوں گے۔ یہاں کی مچھلی کے شکار کے تجربات بالکل انوکھے ہیں۔ اس جگہ کا موسم قدرتی طور پر سال بھر گرم رہتا ہے، چناں چہ یہاں جاتے وقت اپنے ساتھ سن اسکرین بھی لیتے جائیں اور ساحل کی سیر کے وقت ایک تو پینے کا ڈھیروں پانی بھی ساتھ رکھیں اور یہاں خود کو گرمی سے بچائیں، یہ بہت ضروری ہے۔

☆Mayotte:

یہ ملک اتنا زیادہ غیر معروف اور گم نام ہے کہ اس جزیرے کا نام آج تک ورڈ پروسیسر ڈکشنری میں بھی درج نہیں کیا گیا ہے۔ 1843ء میں فرانس نے اس

جزیرے کا کنٹرول حاصل کیا اور آج تک فرانس ہی اس پر حکومت کرتا ہے۔ مایوٹی ایک مہنگا ملک ہے جہاں جانا اور قیام کرنا آسان نہیں ہے، لیکن اگر آپ دولت مند انسان ہیں اور پیسہ آپ کے ہاتھ کا میل ہے تو پھر یہاں کا سفر آپ کو ضرور کرنا چاہیے، کیوں کہ یہاں کا سفر بہت زبردست ثابت ہوگا، یہاں غوطہ خوری، تیراکی، ڈائیونگ اور سفید ریت پر آرام آپ کے سفر کو پرلطف بنا دے گا۔ اس ملک کے سفر کا بہترین وقت جون اور نومبر کے درمیان ہے۔

☆Nauru:

یہ جزیرہ Kiribati کا بحری پڑوسی ہے اور کسی زمانے میں ایک خوش گوار جزیرے کے طور پر جانا جاتا تھا، اس کی وجہ اس کے شہریوں کی دولت کی بڑی مقدار تھی، مگر اب یہ جزیرہ Nauru کہلاتا ہے۔ اس ننھے منے سے جزیرے میں ڈھیروں قابلِ دید مقامات کے ساتھ ساتھ ڈھیروں قدرتی حسین مناظر بھی ہیں۔ اس جزیرے پر پرانے فاسفیٹ کے ذخائر ہیں جنھوں نے اس ملک کو دولت مند بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک Command Ridge بھی ہے یعنی ایک زبردست قسم کا پہاڑی لہریے دار پشتہ جہاں سے دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے دشمن پر نظر رکھی تھی اور یہاں کے حسین و جمیل ساحل بھی قابلِ دید ہیں۔ اس جگہ کی سیاحت کا وقت فروری کے بعد اور نومبر سے پہلے ہے، کیوں کہ ان مہینوں میں موسلا دھار بارشوں سے بچا جا سکتا ہے۔

☆برکینا فاسو:

برکینا فاسو مغربی افریقا میں واقع ایک لینڈ لاکڈ ملک ہے جو چھ مختلف ملکوں کے درمیان واقع ہے اور اپنے خوش مزاج عوام اور اہم شخصیات کے حوالے سے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ ویسے تو برکینا فاسو میں سیاحوں والا روایتی ماحول نہیں ہے،

مگر اگر آپ نے وہاں جانے کا اور اس ملک کو اس کے لوگوں کو دیکھنے کا فیصلہ ہی کرلیا ہے تو آپ کی طبیعت خوش ہوجائے گی، کیوں کہ یہاں کے کلچر یعنی ثقافتیں بہت عمدہ ہیں اور سیاح ان سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔ اس ملک کی سیاحت اور سیر وسفر کا بہترین وقت اکتوبر اور دسمبر کا ہے تاکہ یہاں کے تکلیف دہ نم موسم سے بچا جاسکے۔

☆آئیوری کوسٹ:

آئیوری کوسٹ ایک اور افریقی ملک ہے جس کی سرحدیں برکینا فاسو سے ملتی ہیں۔ اس کا ساحل کسی زمانے میں یعنی 1,000 اور 1,500 عیسوی کے درمیان ایک بہت اہم تجارتی راستہ تھا اور اسی زمانے میں بہت سی سلطنتیں اور بہت سی ثقافتیں ظہور میں آئیں۔ بعد میں آئیوری کوسٹ ایک تجارتی بندرگاہ بن گیا جسے یورپی اقوام بھی استعمال کرتی تھیں اور پھر 1893 میں فرانس نے اس پر قبضہ کرلیا۔ مگر یہاں کے مقامی افراد نے 1961ء میں آزادی حاصل کرلی۔

آئیوری کوسٹ اصل میں گھنے بارانی جنگلات کا گھر ہے اور یہاں کے سفید ساحل بھی زبردست ہیں جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں آنے والے سیاح ان ساحلوں سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس ملک کی سیاحت کا بہترین وقت نومبر اور مارچ کے اوائل کا زمانہ ہے۔

☆Tuvalu:

یہ ایک پولی نیشیئن جزیرہ ہے جس کا پرانا نام Ellice Islands تھا۔ یہ آسٹریلیا اور ہوائی کے درمیان نصف راستے پر واقع ہے اور کسی زمانے میں یعنی 1892 اور 1916 کے درمیان یہ ایک برٹش پروٹیکٹوریٹ بھی تھا۔ اس کی زمین پانی کی سطح سے بہت معمولی سی بلند ہے، جس کی وجہ سے یہاں موجودہ گلوبل وارمنگ کا بحران نہایت سنگین ہوگیا ہے اور یہ اس جزیرے کے لیے ایک بہت خوف ناک خطرہ بن چکا ہے۔ یہاں کا بلندترین مقام پانی کی سطح سے صرف 16 فیٹ بلند ہے۔ Tuvalu کی سیر وتفریح کا بہترین وقت مئی اور اکتوبر کے درمیان کا ہے تاکہ نم اور مرطوب موسم سے بچا جاسکے۔

☆Andorra:

یہ بھی ہر طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ملک ہے جو Pyrenees کے پہاڑوں کے درمیان فرانس اور اسپین کے درمیان واقع ہے۔ یہاں کے مناظر نہایت حسین وجمیل ہیں اور ان پہاڑوں پر ہائیکنگ یا کوہ پیمائی کے مواقع بھی موجود ہیں، اندورا دوسرے یورپی ملکوں کی طرح کسی زمانے میں ایک feudalistic society میں بادشاہوں اور دوسرے حکمراں خاندانوں کے زیر نگیں رہا۔ یہاں بہت سی قدیم ترین سائٹس بھی ہیں جیسے Casa de la Val جو ایک جاگیر ہے، یہاں ایک دفاعی ٹاور بھی ہے جو 1580 میں تعمیر کیا گیا تھا۔ Andorra اپنے شان دار اور ذائقے دار کھانوں کے حوالے سے بھی مشہور ہے، یہاں کے ریسٹورنٹ بہترین ورائٹیز پیش کرتے ہیں۔ اس ملک کی سیاحت کا بہترین وقت اپریل اور اکتوبر کے درمیان کا ہے۔

☆Liechtenstein:

Liechtenstein بھی ہر طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ملک ہے جو وسطی یورپ میں آسٹریا اور سوئزرلینڈ کے درمیان واقع ہے۔ ان لوگوں کی بنیادی زبان جرمن ہے۔ کسی زمانے میں یہ جرمن کنفیڈریشن کا حصہ تھا اور 1866 میں اسے چھوڑ کر آزاد ہوگیا۔ 1968 میں اپنی فوج کی تباہی کے بعد یہ اس وقت سے غیر جانب دار بن گیا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ مائیکرو اسٹیٹ صرف 62 مربع میل یا 160 مربع کلومیٹرز پر مشتمل ہے۔ اگر آپ اسنو بورڈنگ اور اسکیئنگ کے لیے موسم سرما میں جانا چاہتے ہیں تو Liechtenstein کا یہ ملک اپنی ڈھلوانوں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے، اس کے علاوہ موسم گرما میں آپ ہائیکنگ کے علاوہ ماؤنٹین بائیکنگ سے بھی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

☆Palau:

یہ ملک مغربی بحرالکاہل میں واقع ہے اور اس کے اطراف متعدد چھوٹے چھوٹے اور خوب صورت جزائر بکھرے پڑے ہیں۔

دنیا کے کئی ملک Palau پر دعویٰ کرچکے ہیں جن میں اسپین، جرمنی اور جاپان شامل ہیں۔ Palau کو دنیا بھر میں ڈائیونگ یعنی غوطہ خوری اور اسنارکلنگ کے بہترین مقامات میں شمار کیا جاتا ہے، جہاں متعدد کورل ریفس بھی ہیں اور متعدد جنگوں کے نتیجے میں ڈوبے ہوئے بحری غرقاب جہاز بھی ہیں۔ ان کے

علاوہ متعدد چھپے ہوئے غار، سرنگیں اور درجنوں عمودی ڈھلوانیں بھی ہیں گویا پانی کی دنیا کی مختلف اقسام یہاں موجود ہیں۔ Palau کو دیکھنے اور اسے سمجھنے کے لیے یہاں جانے کا بہترین وقت فروری اور مارچ کے مہینے ہیں۔

☆South Ossetia:

یہ جنوبی Caucasus میں واقع روسی بولنے والی مائیکرو اسٹیٹ ہے جو اتنی زیادہ نامعلوم ہے کہ گوگل کے پاس بھی اس کے حوالے سے قابل قدر معلومات نہیں ہے۔ یہاں کا سفر سب سے زیادہ مشکل اور سخت ہے، کیوں کہ یہ جارجیا کے خود مختار Oblast میں شامل ہے۔ اس ملک کی سیاسی اور سازشوں سے بھری ہوئی کہانیاں بہت دل چسپ ہیں۔

☆Futuna:

Futuna کا یہ ننھا منا سا جزیرہ بہ مشکل 50 مربع میل یعنی 80 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے اور اس چھوٹے سے جزیرے کی آبادی 5,000 نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ ملک پولی نیشیا کے درمیان واقع ہے اور یہ یکساں طور نامعلوم ایک اور ملک Wallis کے ساتھ پیئر بناتا ہے۔ Futuna کا کلچر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہیں بدل سکا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جدید دنیا نے اسے کرپشن میں ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔ اگر آپ گزرے ہوئے وقت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بہترین وقت اپریل اور اکتوبر کی درمیانی مدت ہے، لیکن اگر آپ دیگر مہینوں میں وہاں جانا چاہتے ہیں تو وہاں کی بارشیں دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔

☆Nagorno Karabakh:

نوگورنو کاراباخ ایک اور خشکی سے گھرا ہوا خطہ ہے جو جنوبی Caucasus میں واقع ہے۔ نوگورنو کاراباخ، آذربائیجان، آرمینیا اور ایران کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ یہ مکمل طور پر پہاڑی خطہ ہے جو گھنے اور حسین جنگلات سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں متعدد میوزیم بھی ہیں جہاں جاکر آپ اس ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرسکتے ہیں جس میں آرمینیا کے ساتھ ایک جنگ بھی شامل ہے۔ نوگورنو کاراباخ تاریخ کے مسافر کے لیے ایک بالکل پرفیکٹ جگہ ہے۔

☆وفاقی ریاست ہائے مائیکرونیشیا:

وفاقی ریاست ہائے مائیکرونیشیا اصل میں چار ریاستوں پر مشتمل ہے جو یہ ہیں: Yap, Chuuk, Pohnpei اور Kosrae اور یہ سب مغربی بحرالکاہل میں واقع ہیں۔ ہر ریاست کا اپنا کلچر اور اپنی شناخت ہے جس کو کھوجا جاسکتا ہے، اس کے اطراف میں واقع پانی کی معلومات بھی جمع کی جاسکتی ہے۔ یہ وفاقی ریاستیں مونگے کی حیات سے مالا مال ہیں، ہر ریاست کی الگ آب و ہوا ہے، مثال کے طور پر Yap بہت خشک آب و ہوا کا مالک ہے، جب کہ Pohnpei میں بہت زیادہ بارشیں ہوتی ہیں۔ اس ملک نے دنیا کے مختلف ملکوں کے ساتھ اتحاد قائم

کیے، اس لیے اس کی تاریخ اکثر بدلتی رہی ہے، لیکن اس کا اعتماد یو ایس اے کے ساتھ قائم ہے۔

☆جزائر فاک لینڈز:

ایک برطانوی علاقہ اور سیاحوں کے لیے دل چسپی کی جگہ، جزائر فاک لینڈز اصل میں جنوبی بحرالکاہل کی Patagonian Shelf پر ایک مجموعہ الجزائر ہیں۔ فاک لینڈ پینگوئنز، سیلز، الباٹروس اور دوسری انٹارکٹک مخلوق کے گھر ہیں۔ ان جزائر پر آپ کو مصروف رہنے کے لیے متعدد میوزیم بھی ہیں اور جنگی یادگاریں بھی۔ جانے سے پہلے گرم ملبوسات پیک کرلیں، کیوں کہ یہاں کا موسم سال بھر 75 درجے فارن ہائیٹ یا 24 درجے سینٹی گریڈ سے اوپر جاتا ہے۔

☆Ascension :

یہ ایک الگ تھلگ اور آتش فشانی جزیرہ ہے جو جنوبی بحرالکاہل میں واقع ہے۔ Ascension درحقیقت ایک نادر قسم کا جزیرہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں تک پہنچنا خاصا مشکل ہے، کیوں کہ ایک تو یہاں زیادہ مسافر اور سیاح نہیں جاتے، اس لیے یہاں سہولیات نہیں ہیں۔ اس جزیرے میں مستقل طور پر رہنے والوں کی تعداد 880 ہے جو اس کے دارالحکومت جارج ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ یہ جزیرہ مشہور و معروف سینٹ ہیلینا کے قریب واقع ہے۔

Lahore International Magazine
Instagram: @lahoreintl
Twitter : @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

جیجیل یا جُجورانا: پاکستان میں بجلی کی تاروں سے 'پرندوں کے بادشاہ' کو خطرہ

شعبہ انٹرنیشنل

تحریر: محمد زبیر خان

جیجیل یعنی ویسٹرن ٹراگوپن دنیا کا خوبصورت ترین اور شرمیلے مزاج کا ایک نایاب پرندہ ہے۔ یہ شکاریوں سے آنکھ بچا کر اپنی نسل کے بقا کی اپنی سی کوشش میں ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقے کوھستان میں ویسٹرن ٹراگوپن کو جیجیل اور بھارت ہماچل پر دیش میں ججورانا کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کا مطلب 'پرندوں کا بادشاہ' ہے۔

عموماً پرندوں کا یہ بادشاہ رات کو اور علی الصبح باہر نکلتا ہے۔

انٹرنیشنل یونین فار کنزرویشن آف نیچر (آئی یو سی این) کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں اس پرندے کی سب سے زیادہ تعداد پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا کی وادی پالس میں پائی جاتی ہے۔ تاہم یونین نے اس نایاب پرندے کی مکمل معدومی کا خدشہ بھی ظاہر کیا ہے۔

اس وقت دنیا میں ویسٹرن ٹراگوپن کی مجموعی تعداد پچیس سو سے تین ہزار تک بتائی جاتی ہے۔

وادی پالس کے شاہی جوڑوں کے اونچے محلات

محکمہ وائلڈ لائف کے ایک سروے کے مطابق پالس میں اس پرندے کے چھ سو جوڑے یعنی ان کی کل تعداد بارہ سو تک بنتی ہے۔ محکمہ جنگلی حیات کے اہلکار افتخار احمد نے بی بی سی کو بتایا کہ انڈیا اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے چند علاقوں میں بھی یہ پرندہ پایا جاتا ہے۔

افتخار احمد کے مطابق گرمیوں میں چوبیس سو سے چھتیس سو میٹر اور سردیوں میں دو ہزار سے اٹھائیس سو میٹر بلندی کے جنگلات اس کی آماجگاہیں ہوتی ہیں۔

پرندوں کے بادشاہ سے ہر کوئی دوستی کا خواہشمند

رب نواز، جن کا پرانا نام راب ویل تھا، کو برطانیہ سے پاکستان منتقل ہوئے تقریباً 25 سال ہونے کو ہیں۔ ان کی پاکستان منتقل ہونے کی ایک وجہ یہ پرندہ بھی تھا۔

وہ اس وقت ایک ادارے ورلڈ وائلڈ فنڈ پاکستان (ڈبلیو ڈبلیو ایف پاکستان) میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے ہی پہلی مرتبہ اس نایاب پرندے کی وادی پالس میں موجودگی کے بارے میں ویڈیو بنائی تھی۔

رب نواز نے بی بی سی کو بتایا کہ 'میں پہلی مرتبہ پاکستان سنہ 1994 میں پرندوں کے تحفظ سے متعلق کام کرنے والے ایک ادارے کی دعوت پر آیا۔'

انھوں نے بتایا کہ اس دورے کے بعد انھیں اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یو این ڈی پی کے ساتھ بھی تین سال تک پاکستان میں کام کرنے کا موقع ملا اور اس دوران وہ وادی پالس کے قریبی علاقے مانسہرہ میں قیام پذیر رہے۔

ان کا کہنا ہے کہ وہ پہلی بار دسمبر 1996 میں وادی پالس میں اس پرندے کی تلاش میں گئے تھے۔

رب نواز کا کہنا ہے اس پرندے کی تلاش میں مقامی آبادی نے بھی ان کی مدد کی۔ انھوں نے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ 'جب ہم نے مقامی آبادی کو اپنے دورے کا مقصد بتایا تو بابا راول نامی ایک بزرگ نے کہا کہ جیجیل تو ہمارا ابھی دوست ہے۔'

رب نواز کے مطابق بابا راول نے انھیں بتایا کہ جیجل کے لیے وادی میں ملک رؤف نامی شکاری سے ملنا ہو گا۔

وہ بتاتے ہیں کہ 'تین چار گھنٹے انتہائی مشکل پہاڑ سر کرنے کے بعد جب وہ ملک رؤف کے علاقے میں پہنچے تو اچانک جیجیل ہمارے سامنے سے گزر کر چلا گیا۔ تھوڑا آگے بڑھے تو یہ پرندے مزید تعداد میں نظر آئے۔'

ان کا کہنا ہے کہ 'خوشی کے مارے ہم نے چیخنا اور ناچنا شروع کر دیا جس پر ملک روف نامی شکاری پریشان ہوگیا کہ یہ تو عام پرندہ ہے اس پر یہ لوگ اتنے خوش اور پر جوش کیوں ہیں۔'

ان کا کہنا ہے کہ شکاری یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ کتنا قیمتی اور نایاب پرندہ ہے۔

جیجیل سے پہلی ملاقات

رب نواز نے بتایا کہ جب انھوں نے ڈبلیو پی اے کے چیرمین بریگیڈیئر ریٹائرڈ مختیار محمد کو وادی پالس میں جیجیل کی موجودگی کے بارے میں بتایا تو انھوں نے رب نواز کو چیلنج دیا کہ وہ پالس جا کر اس پرندے کی فلم بنائیں۔

رب نواز بتاتے ہیں کہ 'اس کے لیے موسم گرما میں وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ پالس گئے۔

’کیمپ لگایا مگر وہاں پر ہم آگ نہیں لگا سکتے تھے کیونکہ پھر جیجیل سامنے نہ آتا۔ ہمارے کیمرہ مین رضا عباس بہت سگریٹ پیتے تھے مگر یہاں یہ سب ممکن نہیں تھا۔ ہم چار دن تک جیجیل کو دیکھنے اور اس کی عکس بندی کی کوشش کرتے رہے مگر کامیابی نہیں ملی۔‘

رب نواز بتاتے ہیں کہ ’یہ پرندہ ہمارے سامنے ہی تھا، اس کی آواز آرہی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ پانچواں اور آخری دن تھا ہم بہت مایوس ہو چکے تھے۔‘

ان کے مطابق جب وہ تھوڑی چڑھائی پر گئے تو انھیں دوبارہ اس پرندے کی آواز سنائی دی جس پر وہ فوراً اپنے ساتھی کیمرہ مین کے پاس آئے اور انھیں کچھ چڑھائی پر چلنے کو کہا۔

’مجھے تقریباً پانچ چھ میٹر کے فاصلے سے پھر جیجیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا تو ’پرندوں کا بادشاہ‘ بالکل میرے سامنے تھا۔ میں نے فوراً ہی کیمرہ نکالا اور ریکارڈ بٹن دبا دیا۔‘

ان کا کہنا ہے کہ وہ اس پرندے کی چھ سات منٹ کی فلم بنانے میں کامیاب رہے جس کا بین الاقوامی سطح پر بہت چرچا ہوا کیونکہ جنگلی حیات کے ماہرین پہلی مرتبہ اس پرندے کی فلم بننے پر بہت پرجوش تھے۔

پرندوں کے بادشاہ کا شکار ممنوع

جیجیل کی اہمیت اور نایابی کا اندازہ ہونے کے بعد وادی پالس کے مقامی عمائدین نے جرگہ بلا کر اس پرندے کی حفاظت یقینی بنانے اور اس کے شکار پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔

اکبر خان اسی مقامی جرگہ کے رکن ہیں۔ انھوں نے بی بی سی کو بتایا کہ اس نایاب پرندے کے شکار پر وادی پالس میں جرمانہ بھی عائد ہے کیونکہ جیجیل کی وجہ سے وادی پالس کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

’ہم لوگ جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے قائم کیے گئے محکمے سمیت اس پرندے کی حفاظت کے لیے کوشاں دیگر غیر سرکاری اداروں کے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہیں۔‘

محمد مستان اس پرندے کے ساتھ مقامی آبادی کے لگاؤ کا ایک منفرد اور انوکھا واقعہ بتاتے ہیں کہ وہ چند برس قبل اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دعوت پر وادی پالس گئے جہاں انھیں علم ہوا کہ میزبانوں نے جیجیل کا شکار کر کے اپنے کچھ خاص مہمانوں کو اس کا گوشت پیش کیا لیکن اہالیان علاقہ نے متفقہ طور پر ان کے کھانے کی دعوت کا بائیکاٹ کر دیا۔

وہ بتاتے ہیں اس کے بعد دوبارہ ایسا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا جس میں مقامی آبادی نے اس پرندے کا شکار کیا ہو یا اس کو نقصان پہنچایا ہو۔

جیجیل پر کسی وقت بھی بجلی گر سکتی ہے

پالس کے رہائشیوں کا کہنا ہے کہ حفاظتی اقدامات اٹھانے سے اس پرندے کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

مگر پرندوں کے بادشاہ کو یہ تحفظ شاید اب زیادہ عرصہ حاصل نہیں رہے گا۔ اس کی وجہ خراب ماحول نہیں بلکہ اسے خراب کرنے والے ترقیاتی منصوبے ہیں۔ سرکاری دستاویزات کے مطابق داسو ڈیم کی مجوزہ ٹرانسمیشن لائن وادی پالس سے گزرے گی۔

مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ ’ٹرانسمیشن لائن بچھانے کے لیے بنیادی کام بھی شروع ہو چکا ہے یعنی کھمبے اور تاریں علاقے میں پہنچا دی گئی ہیں جو ان پرندوں کے لیے کسی پھانسی کے پھندے سے کم نہیں ہیں۔‘

واپڈا کی تیار کردہ ماحولیات کی تشخیص رپورٹ کے مطابق پالس سے ٹرانسمیشن لائن گزرنے سے ویسٹرن ٹراگوپن سمیت دیگر نایاب پرندوں اور جنگلی حیات کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

وادی پالس کو پرندوں کے حوالے سے برڈ لائف انٹرنیشنل لندن نے انتہائی اہم علاقہ قرار دیا ہے۔ تاہم واپڈا کی رپورٹ کے مطابق داسو ڈیم منصوبے کے علاقے میں ان پرندوں کی آماجگاہیں محفوظ نہیں رہیں گی۔

واپڈا کی رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد صوبہ خیبر پختونخوا کے محکمہ وائلڈ لائف نے حکومت کو تجویز دی ہے کہ کوھستان کی وادی پالس کو جنگلی حیات کے لیے محفوظ علاقہ قرار دے کر تحفظ یقینی بنایا جائے۔

اس میں جیجیل یعنی ویسٹرن ٹراگوپن کے تحفظ کی سفارش پہلے نمبر پر کی گئی ہے۔

اس سفارش کی وجہ بتاتے ہوئے وائلڈ لائف کے افتخار احمد کے مطابق ٹرانسمیشن لائن کا وادی پالس سے گزرنا جیجیل کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اکثر پرندے ٹرانسمیشن لائن اور بجلی کے کھمبوں سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔

افتخار احمد کہتے ہیں کہ ’غیر فطری ہلاکتوں کا شکار ہونے سے اس پرندے کی آبادی مزید کم یا مکمل معدوم ہوسکتی ہے۔‘

جیجیل کے محافظوں کی پریشانی

وادی پالس کے باسیوں نے ویسٹرن ٹراگوپن کی حفاظت کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ مقامی رہائشی اور پیشہ کے لحاظ سے استاد مستان خان نے بی بی سی کو بتایا کہ ’جیجیل ہمارے لیے تعلیم، روزگار اور صحت کے مواقع لے کر آیا ہے۔ اس کا تحفظ ہمارے لیے سب سے اہم ہے۔‘

وہ بتاتے ہیں کہ ’علاقے کے سب لوگ جیجیل کا تحفظ اپنے بچوں کی طرح کرتے ہیں۔‘ ان کا کہنا ہے کہ ٹرانسمیشن لائن کو وادی پالس کے بجائے کسی دوسری جگہ سے بھی گزارا جاسکتا ہے۔

اسی وادی کے باسی ایک اور سکول ٹیچر امان اللہ کا کہنا ہے کہ اس پرندے کی بدولت پالس کے کئی مسائل حل ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اب مقامی آبادی کو بھی اس کی اہمیت کا اندازہ ہے۔

شعبہ انٹرنیشنل

بھوپت ڈاکو: انڈیا کا وہ ڈاکو جسے پاکستان نے پناہ دی

تحریر: ریحان فضل

جب بھی پاکستان کی جانب سے انڈیا کے کسی مجرم کو پناہ دی جاتی ہے تو پوری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف ہوتی ہیں۔

1993 میں ممبئی میں ہونے والے دھماکوں کے اہم ملزم داؤد ابراہیم کے پاکستان بھاگ جانے اور وہاں بسنے کی خبریں آئیں تو انڈیا نے اسے ایک بڑا معاملہ بنالیا۔

حالانکہ پاکستان ہمیشہ اس بات کی تردید کرتا رہا ہے کہ داؤد ابراہیم اس کی سرزمین پر نہیں رہ رہا ہے لیکن داؤد ابراہیم کے مبینہ طور پر پاکستان جانے سے 40 برس پہلے بھی ایک ایسا موقع آیا تھا کہ جب پاکستان نے انڈیا سے بھاگے ہوئے ایک ڈاکو بھوپت کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔

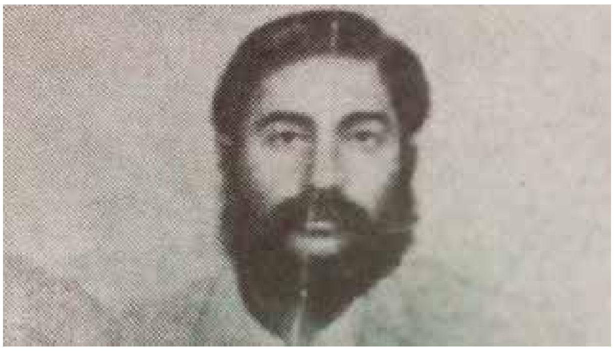

50 کی دہائی میں بھوپت ڈاکو گجرات اور راجستھان میں کافی سرگرم ہو چکا تھا اور کہا جاتا ہے کہ جولائی 1949 اور فروری 1952 کے درمیان بھوپت اور اس کے گینگ پر 82 ہلاکتوں کا الزام تھا۔ ان میں سے آخری دو ہلاکتیں فروری 1952 میں کی گئیں تھیں۔

اس کے بعد انڈین پولیس نے اس پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ گیا۔

وہاں اس کو گرفتار کیا گیا اور پاکستان میں غیر قانونی طریقے سے داخل ہونے اور ہتھیار رکھنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور وہاں کی ایک عدالت نے اسے ایک سال کی سزا سنائی۔

کلاسیفائیڈ فائلز میں بھوپت کا ذکر

مشہور کتاب 'دا پیپل نیکسٹ ڈور: دا کیوریس ہسٹری آف انڈیاز ریلیشن ود پاکستان' کے مصنف اور پاکستان میں انڈیا کے سفیر کے عہدے پر رہ چکے ڈاکٹر ٹی سی اے راگھون بتاتے ہیں 'اس کے بارے میں نے ایک فائل دیکھی تھی جو میرے پاس ڈی کلاسیفائیڈ کرنے کے لیے آئی تھی تا کہ اسے نیشنل آرکائیوز میں بھیجا جا سکے۔ یہ معاملہ اتنا اہم تھا کہ اس کے بارے میں دونوں ممالک کے درمیان کئی بار اعلیٰ سطحی بات چیت ہوئی۔ مشکل یہ تھی کہ اس مطالبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انڈیا کے پاس کوئی قانونی جواز نہیں کیونکہ تب تک دونوں ممالک کے درمیان ملک سے بھاگے ہوئے لوگوں کو واپس کرنے سے متعلق کوئی معاہدہ طے نہیں پایا تھا۔'

ان کا کہنا ہے 'جب انڈیا کے اس وقت کے سفارتخانے کی جانب سے بھوپت ڈاکو کو ملک واپس لانے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں تو انھوں نے پاکستان کی حکومت پر یہ الزام لگایا کہ وہ سیاسی طور پر اتنی کمزور ہے کہ ووٹوں کی پرواہ کیے بغیر بھوپت کو انڈیا کو سونپنے کی ہمت نہیں کرسکتی۔'

انڈیا اور پاکستان کے وزراء اعظم کے درمیان بھوپت سے متعلق بات چیت

بھارت کی جانب سے مستقل دباؤ اور میڈیا میں لگاتار اس پر بحث کی وجہ سے جولائی 1956 میں اس وقت کے انڈیا کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کے درمیان اس بارے میں بات چیت ہوئی۔

اس کے بعد نہرو نے وزارت خارجہ کی فائل پر لکھا 'پاکستان کے وزیر اعظم نے میرے سامنے بھوپت کا معاملہ اٹھایا۔ میرے خیال سے اس بارے میں شروعات ان کی طرف سے ہوئی۔ مسٹر بوگرہ نے کہا وہ پوری طرح سے اس بات سے متفق ہیں کہ بھوپت کی حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیے تھی۔ اسے انڈیا واپس بھیجے جانے کے بارے میں انہوں نے یہ کہہ کر ہاتھ جھاڑ لیے کہ دونوں ممالک کے درمیان ملک سے بھاگ کر آنے والوں کو واپس کرنے سے متعلق معاہدہ ہی موجود نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسے انڈین حکومت کو اطلاع کرنے کے بعد سرحد پر چھوڑنے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'

بلٹز کے صفحہ اول پر بھوپت کی خبر

لیکن کسی طرح یہ خبر انڈین میڈیا میں لیک ہوگئی اور پاکستان اپنی اس پیش کش سے پیچھے ہٹ گیا۔

انڈین میڈیا میں اس وقت بھوپت سے متعلق خبریں چھائی رہتی تھیں۔ بلٹز نے اپنے اپریل 1953 کے ایڈیشن میں سرخی شائع کی ’کیا بھوپت پاکستانی فوج کے بھارتیہ ڈاکوؤں کو بھرتی کر رہا ہے؟‘

اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بھوپت پاکستانی فوج کے خفیہ ادارے کے لیے بھارتی ڈاکوؤں کو بھرتی کر رہا ہے اور ایک ٹاپ سیکرٹ مشن کے لیے انڈیا پاکستان سرحد کے نزدیک گھوم رہا ہے۔

بھارت نہ بھیجے جانے کی کوشش

ٹی ایس اے راگھون بتاتے ہیں ’میڈیا کی قیاس آرائیوں کے درمیان بھوپت کی حکمت عملی یہ تھی کہ کسی بھی صورت میں پاکستان اسے انڈیا کے حوالے نہ کرے جہاں اسے پھانسی پر لٹکایا جانا تقریباً طے تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس کے بعض حامیوں نے سڑکوں پر ڈرامے کر کے اس کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے تقریباً 1500 روپے جمع کیے۔ اس زمانے میں یہ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اس سب سے بھوپت کی اتنی حوصلہ افزائی ہوئی کہ اس نے ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنایا جس میں جوناگڑھ پر بھارتی فوج کی قبضے کو دکھایا جاتا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اس طرح کی فلم سے انڈیا کے خلاف پاکستان کے پروپیگنڈا کو فروغ ملے گا۔‘

بھوپت نے خود کو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے والا بتایا

بھوپت کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ انڈیا بھیجے جانے سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ وہ خود کو جوناگڑھ کی آزادی کے لیے لڑنے والا شخص بتائے۔ اس نے صوبے سندھ کی ایک عدالت میں یہ دلیل دی کہ اس نے آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا ہے اور اسی بنیاد پر رہائی کا مطالبہ کیا۔

بلٹز اخبار نے بھوپت کے ان دلائل کو شائع کرتے ہوئے لکھا ’جب میری ریاست جوناگڑھ پاکستان میں ضم ہوگئی تو بھارتی فوج نے اس پر حملہ کر دیا۔ ہم نے طاقت کا جواب طاقت سے دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ساڑھے تین سالوں تک بھارتی فوج کا مقابلہ کیا لیکن آخر میں فتح ان ہی کی ہوئی۔ اس کے بعد مجھے انڈیا چھوڑنے اور پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ میں پاکستان کا وفادار ہوں جس نے مجھے پناہ دے کر میری زندگی بچائی۔ پاکستان کی حفاظت کے لیے میں اپنے جسم کے خون کی آخری بوند تک دینے کے لیے تیار ہوں۔‘

پاکستان میں ہی موت

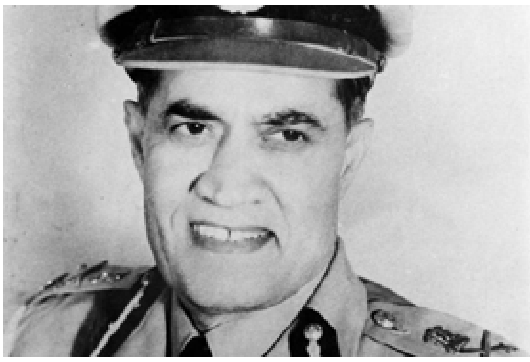

راگھون بتاتے ہیں ’جوناگڑھ کے فریڈم فائٹر ہونے کی بھوپت کی دلیل آخر کار رنگ لائی اور اسے پاکستان میں پناہ دے دی گئی۔ وہ 2006 میں اپنی وفات تک پاکستان میں ہی رہے۔ انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام مذہب قبول کر لیا تھا اور اپنا نام امین یوسف رکھ لیا تھا۔ اس نے وہاں دوبارہ شادی کی اور اس کے دو بچے بھی ہوئے۔‘

بھوپت پر کتاب

بعد میں بھوپت کا پیچھا کرنے والے پولیس افسر وی جی کانٹکر نے مراٹھی زبان میں ایک کتاب لکھی۔

انہوں نے بتایا کہ بھوپت ہر واردات کے بعد ایک تحریری پیغام میں پولیس کو وارننگ دے کر جاتا تھا جسے ’جاسا‘ کہا جاتا تھا۔

کانٹکر کہتے ہیں وہ انہیں ہمیشہ ’ڈیکرا‘ کر کے مخاطب کرتا تھا جبکہ وہ عمر میں ان سے دس برس چھوٹا تھا۔ ڈیکرا کا مطلب ہوتا ہے بیٹا۔

کانٹکر نے بھوپت کو پکڑنے کے لیے پیروں کے نشان پہچاننے والے ماہرین کی مدد لی تھی۔

ایک پولیس انکاؤنٹر میں اس کے ساتھی دیوایت کی موت کے بعد بھوپت نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ پاکستان بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے ایک ساتھی امر سنگھ کچھ دنوں کے بعد انڈیا واپس لوٹ آئے۔ بعد میں خبر آئی کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد بھوپت نے دودھ فروخت کرنے کا کاروبار شروع کر دیا۔

کانٹکر 1969 میں سی آر پی ایف کے ڈارئکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

اُلوؤں کی چوری کیوں بڑھتی جارہی ہے؟

سکاٹ لینڈ کے لوئس جزیرے پر وہ ایک عام طوفانی رات تھی۔

صبح ہوئی تو تیز ہواؤں میں ہی وہاں کے رہائشی ڈونلڈ میکلیوڈ اپنے پالتو جانوروں کا احوال جاننے کے لیے باہر نکلے۔ یہ ڈونلڈ کا معمول تھا۔ لیکن جب وہ اپنے پرندوں کے کابک کے پاس پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ اس کی چھت غائب ہے۔

ڈونلڈ نے دیکھا کہ کابک کی چھت کو کسی نے اوپر سے کاٹ دیا تھا اور ان کا پالتو الّو سکریمپ بھی غائب تھا۔ کسی نے یا تو اسے چرا لیا یا پھر وہ چھت کے کٹتے ہی خود فرار ہو گیا۔

ڈونلڈ نے باز اور دوسرے پرندوں کو پالنے کی تربیت حاصل کر رکھی ہے۔ وہ اپنے پانچ سالہ پالتو الّو سکریمپ کی مدد سے ان بچوں کا دل بہلاتے تھے جو ان کے یہاں آتے تھے۔ ڈونلڈ آئل آف لوئس میں ایک 'بیڈ اور بریکفاسٹ' نامی ریستوراں چلاتے ہیں جہاں لوگ ناشتے اور کھانے کے لیے آتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے بچوں کو وہاں چھوڑ بھی سکتے ہیں۔

ڈونلڈ اپنے پالتو الّو سکریمپ کی چوری سے بہت رنجیدہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سکریمپ ان کے خاندان کا رکن تھا۔ اس کی غیبت سے انھیں بہت صدمہ پہنچا ہے۔

ڈونلڈ کے چڑیا خانے میں چوری عام واقعہ نہیں ہے۔ لوئس جزیرے کے کنارے ڈونلڈ کا ریستوراں رہائشی علاقے سے دور ہے۔ یہاں جرائم بہت کم ہیں۔ عام چوری تو رہنے دیں پرندوں کی چوری غیر معمولی بات ہے۔

لیکن اب اس قسم کا جرم بار بار ہو رہا ہے۔ پرندوں کو پالنے والوں کے لیے اب یہ معمول کی بات ہے۔ یہ شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مجرم پیشہ افراد ان پرندوں کو نقد رقم کے لیے چوری کر رہے ہیں۔

نقدی سے چوری کا تعلق

آج دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں کیش لیس لین دین کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور اس دہائی کے اختتام تک کیش لیس یا غیر نقدی لین دین 726 ارب تک پہنچ جائے گا۔ اس میں 2015 سے ہر سال 10.9 فیصد کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔

انڈیا میں بھی کیش لیس لین دین پر ہی زور ہے۔ برطانیہ میں بھی نقد لین دین میں کمی واقع ہوئی ہے اور 2016 کے مقابلے میں وہاں نقد ٹرانزیکشن 15 فیصد کم ہو کر 13.1 ارب رہ گیا ہے جبکہ کارڈ سے ادائیگی میں اضافہ ہوا ہے۔

جاپان میں نقد لین دین میں سنہ 2017 میں 8.5 فیصد کمی آئی ہے جبکہ چین میں سنہ 2016 کی ایک سہ ماہی میں موبائل ادائیگیوں میں 20 فیصد اضافہ ہوا ہے۔

لیکن جوں جوں کارڈ، موبائل اور آن لائن ادائیگی میں اضافہ ہو رہا ہے دکانوں اور دیگر کاروباری افراد کے یہاں نقد رکھنے کا رجحان کم ہو رہا ہے۔ مجرموں کے لیے نقد کی یہ کمی بڑے بحران کی صورت ابھرا ہے۔ کسی بھی چور کے لیے نقد رقم سب سے اچھی چیز ہوتی ہے۔ اسے بہ آسانی لے جایا جا سکتا ہے اور خرچ کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

لیکن جب دنیا کے بیشتر ممالک کیش لیس کی جانب جا رہے ہیں ایسے میں مجرم اپنے فوری غیر قانونی آمدنی کے نئے طریقے تلاش کر رہے ہیں۔

پرندوں کی چوری

سویڈن میں گذشتہ سال نقد میں کل لین دین صرف دو فیصد ہی تھا۔ سویڈن کی 20 فیصد آبادی نے تو ایک بار بھی نقدی نہیں نکالی۔ ایسے میں وہاں کے مجرموں کے مسائل میں یقیناً اضافہ ہوا۔

1990 کی دہائیوں میں سویڈن میں جہاں اوسطاً 100 بینک ڈکیتیاں ہوتی تھیں وہ گذشتہ چار سالوں میں 30 تک آ گئیں اور سنہ 2017 میں تو صرف 11

بینک لوٹے گئے۔ اسی طرح گاڑیوں سے بھی لوٹ کے واقعات میں مسلسل کمی دیکھی جا رہی ہے۔

لیکن سویڈن میں جانوروں کی محفوظ نسلوں سے متعلق جرائم بڑھ رہے ہیں۔ سنہ 2016 میں اس طرح کے 156 واقعات درج کیے گئے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حکام کا کہنا ہے کہ نایاب نسل کے الوؤں کے انڈے اور Orchid یعنی ثعلب مصری (ایک قسم کے پھول) کی چوری میں اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔

انھیں کالے بازار میں فروخت کیا جاتا ہے۔ پھر وہاں سے انھیں سمگل کر کے دنیا کے دیگر ممالک، جیسے سعودی عرب، قطر یا متحدہ عرب امارات، بھیجا جاتا ہے۔ ان ممالک میں معدوم نسل کے پرندے پالنا دولت مندی کی نشانی ہے۔ سویڈن کے پولیس افسر فلیپو بیسینی کا کہنا ہے کہ کالے بازار میں ایک بھورے الو کی قیمت 11 لاکھ ڈالر تک مل جاتی ہے۔

یہ معاملہ صرف سویڈن تک ہی محدود نہیں۔ بہت سے دوسرے ممالک میں ناپید ہونے والے جاندار کی چوری اور سمگلنگ میں اضافہ ہوا ہے۔

آج برطانیہ میں صرف 40 فیصد لین دین ہی نقد میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی معدوم نسلوں سے متعلق جرائم بڑھ رہے ہیں۔

سکریمپ جیسے الو کے لیے تو صرف 100 پاؤنڈ ہی ملیں گے لیکن خانہ بدوش مادہ باز کے چار ہزار پاؤنڈ تک مل سکتے ہیں۔ سائبریا کے سیاہ باز کی قیمت 75 ہزار ڈالر تک ہے۔

عرب ممالک میں ان پرندوں کی بہت مانگ ہے۔ اسی وجہ سے ان کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور ان سے منسلک جرائم بھی۔

گلاس ایل یعنی شیشے جیسی بام ماہی

ناپید ہونے کے خطرے سے دوچار بام ماہی کی شیشے والی نسل کی بھی بہت مانگ ہے۔ ایک ٹن وزنی بامی کے لیے آپ کو 80 لاکھ پاؤنڈ یا ایک کروڑ یورو مل سکتے ہیں۔ چین میں ملایم بامی کو گرل کر کے کھانے کا چلن ہے۔

رواں سال تقریباً 100 ٹن بامی کو یورپی ممالک سے سمگل کر کے چین لایا گیا ہے۔ آج اس کا غیر قانونی کاروبار کوکین جیسا منافع بخش سودا ہے۔ حال ہی میں برطانوی پولیس نے ماہی کی سمگلنگ کرنے والے صرف ایک گروہ کی تحقیقات کی ہے تو پتہ چلا کہ پانچ سالوں میں اس نے ڈھائی کروڑ پاؤنڈ کی سمگلنگ کی۔

برطانیہ کے نیشنل وائلڈ لائف کرائم یونٹ کے افسر ایلن رابرٹس کہتے ہیں کہ جنگلی جانوروں سے جرم کی دنیا کا چہرہ مکمل طور پر بدل گیا ہے۔ آج منظم جرائم سے منسلک زیادہ منافع بخش نسلوں کی سمگلنگ کر رہے ہیں۔

البتہ اس طرح کے تمام جرائم کو نقدی کی کمی سے جوڑنا درست نہیں۔ سویڈن کے سابق پولیس افسر بیورن ایرکسن نے نقدی کو چلن میں واپس لانے کی مہم چھیڑ رکھی ہے۔ وہ انٹرپول سے بھی منسلک رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جنگلی جانوروں کی سمگلنگ میں اضافے کا تعلق براہ راست نقدی سے ہے۔

وہ کہتے ہیں: 'اگر نقد رقم نہیں ہوگی تو مجرمان کچھ اور چوری کریں گے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ نقد کی کمی سے ڈکیتیاں رکیں گی۔ شاید بینک چوری نہ ہو لیکن مجرم کسی اور جرم کا رخ کر رہے ہیں۔ نقدی کے متبادل کے طور پر دوسرے جرائم کی تلاش جاری ہے۔'

کس قسم کی چیزیں چوری ہو رہی ہیں؟

پرندوں اور مچھلیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا مشکل ہے۔ لہٰذا اب بڑے سٹورز میں چوری کے دوران چور قیمتی سامان پر زیادہ ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

مثلاً مہنگی جینز، ڈیزائنر ہینڈ بیگ، مہنگے ریزر اور بلیڈ، بے بی فارمولا دودھ، دانتوں کو سفید کرنے والے اور ڈٹرجنٹ پاؤڈر لوٹے جا رہے ہیں۔

اب سٹوروں میں نقد رقم کا لین دین بہت کم ہوتا ہے۔ لہٰذا مجرم قیمتی سامان کے ذریعے نقدی کی کمی پوری کرتے ہیں۔ پھر انھیں بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے رقم حاصل کی جاتی ہے۔

ایسے میں مجرموں کے لیے آئی فونز بھی اچھے اہداف ہیں۔ وہ انھیں دوسرے ممالک لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔ سامان لوٹنا بھی آسان ہے۔ دوا کی دکان سے دواؤں کی چوری بھی آسان ہے۔ ہینڈ بیگ چھیننا بھی بہت آسان کام ہے۔

بعض اوقات مجرمان قیمتی سامان سٹور میں یہ کہہ کر واپس کرتے ہیں کہ ان کی پرچی کھو گئی ہے اور اب وہ اس کے بدلے میں نقد رقم چاہتے ہیں۔ کئی بار وہ گفٹ واؤچر کا حوالہ دے کر بھی پیسے لے جاتے ہیں۔

اب چور خواہ الو کی چوری کریں یا پھر مچھلی چرائیں یا ریزر بلیڈ، ان کا شکار ہونے والوں کو تو ایک جیسا ہی صدمہ پہنچتا ہے۔

جیسے ڈونلڈ میک لیوڈ کے سکریمپ کا جانا۔ وہ کہتے ہیں، 'سکریمپ ہمارے لیے انمول تھا۔'

پولیس اب بھی اس گمشدہ الو کی تلاش میں ہے۔

(بشکریہ بی بی سی اُردو)

برطانیہ میں نکاحِ متعہ کا بڑھتا ہوا رواج

بی بی سی اُردو

نکاحِ متعہ یا وقتی شادی، ایک قدیم روایت ہے جس کے تحت ایک مرد اور عورت کی ایک مقررہ مدت کے لیے شادی کر دی جاتی ہے۔ تاریخی تناظر میں اس کا استعمال اس لیے کیا جاتا تھا تاکہ طویل فاصلے تک سفر کرنے والے افراد مثلاً تاجروں یا فوجیوں، کے پاس کوئی قانونی بیوی ہو۔ مگر نوجوان برطانوی مسلمان اسے کیوں اپنا رہے ہیں؟

برمنگھم کی سارہ کا کہنا ہے کہ 'اس کے ذریعے ہمیں شریعہ کی خلاف ورزی کے بغیر ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل گیا۔ ہم شاپنگ کے لیے جانا چاہتے تھے، کھانے کے لیے جانا چاہتے تھے اور ایک دوسرے کو شادی سے پہلے جاننا چاہتے تھے۔ ہم (متعہ کے بغیر) یہ سب نہیں کر سکتے تھے۔' سارہ کی عمر تیس سال ہے اور وہ پاکستانی نژاد شیعہ مسلمان ہیں۔

سارہ نے اپنی روایتی شادی سے پہلے چھ ماہ تک کے لیے اپنے شوہر سے نکاحِ متعہ کیا تھا۔ سارہ کہتی ہیں 'یہ بنیادی طور پر ایک معاہدہ ہے۔ آپ بیٹھ کے اپنی شرائط طے کرتے ہیں اور کسی ایسی لڑکی جس کی پہلے شادی نہ ہوئی ہو، اُس کے متعہ کے لیے آپ کو لڑکی کے والد کی اجازت چاہیے ہوتی ہے۔'

سارہ کا مزید کہنا ہے کہ 'ہم نے مدت اور میرے والد کی شرائط کا تعین کیا اور میں نے حق مہر (مرد کی جانب سے خاتون کو دیا جانے والا تحفہ) کا مطالبہ کیا۔ یہ سب انتہائی سادہ تھا اور اس میں زیادہ وقت نہیں لگا۔'

سارہ اُن متعدد برطانوی نوجوان مسلمانوں میں سے ایک ہیں جو کہ متعہ کا استعمال کر کے اپنے مذہبی عقیدے اور مغربی طرزِ زندگی کے درمیان توازن پیدا کر رہے ہیں۔

متعہ کی غیر رسمی نوعیت کی وجہ سے برطانیہ میں ہونے والی متعہ شادیوں کے بارے میں اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ تاہم متعدد شیعہ مسلمان علماء اور مسلمان طلبہ تنظیموں نے بی بی سی کو بتایا کہ اس طرح کی شادیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان نکاحِ متعہ کے حوالے سے تضاد پایا جاتا ہے۔ شیعہ مسلمان کا ماننا ہے کہ اس کی اجازت مذہب میں دی گئی ہے جبکہ سنی مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ حرام ہے۔

بریڈفورڈ یونیورسٹی کی اہل البیت اسلامی سوسائٹی کے صدر عمر فاروق خان کا کہنا ہے کہ یونیورسٹیوں میں نکاحِ متعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

وہ کہتے ہیں 'جیسے جیسے مزید طلبہ کو اس کے بارے میں پتا چلتا ہے ویسے ویسے بلاشبہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ طلبہ تعلیم یافتہ افراد ہوتے ہیں اسی لیے وہ اپنے مسائل کا حل اسلامی تناظر میں ڈھونڈتے ہیں۔'

عمر فاروق خان کا مزید کہنا ہے کہ بہت سے لوگ ابھی بھی اس موضوع پر بات نہیں کرتے اور اسے ایک ممنوعہ موضوع سمجھا جاتا ہے۔'

برطانیہ کی اسلامک شریعہ کونسل کی ترجمان اور ایک سنی مسلمان خولہ حسن کہتی ہیں کہ نکاحِ متعہ کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اُن کے مطابق یہ جسم فروشی کے مترادف ہے۔

برطانیہ کی اسلامک شریعہ کونسل کی ترجمان اور ایک سنی مسلمان خولہ حسن کہتی ہیں کہ نکاحِ متاع کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

وہ کہتی ہیں 'مجھے آج تک تاریخ میں کوئی بھی سنی عالم نہیں ملا جس کا کہنا ہو کہ نکاحِ متعہ حلال ہے۔'

نکاحِ متعہ میں نکاح کی مدت اور دیگر شرائط پر اتفاق کیا جاتا ہے۔ نکاحِ متعہ کرنے والے ایک فرد کے والدین کا کہنا ہے کہ اس میں ایسی شرائط بھی رکھی جا سکتی ہیں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان کوئی جسمانی روابط نہیں ہوں گے۔

یہ نکاح چند گھنٹوں سے لے کر کئی سالوں تک کے لیے ہو سکتا ہے۔

لندن کے الخوئی سینٹر کے سید الفدہیل ملانی کو برطانیہ کا اہم ترین شیعہ رہنما تصور کیا جاتا ہے اور انھوں نے اپنی کتاب میں نکاحِ متعہ کا ذکر بھی کیا تھا۔

اُن کا کہنا ہے کہ 'پیغمبرِ اسلام کے دور میں (نکاحِ اسلام) کا استعمال کیا جاتا تھا خاص طور پر جب مرد جنگ یا کاروبار کے لیے دور دراز علاقوں میں جاتے تھے۔'

'اسلام میں گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ جیسے روابط کی اجازت نہیں اسے لیے نکاحِ متعہ ایک دوسرے کو جاننے کا موقع دیتا ہے۔'

سید الفدہیل ملانی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس معاملے پر فرقہ وارانہ اختلاف ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ 'اسلام کے دوسرے خلیفہ عمر ابن الخطاب نے خود بھی کہا تھا کہ متعہ کی پیغمبرِ اسلام کے وقت پر اجازت تھی مگر انھوں نے اسے ممنوع قرار دیا اور کہا کہ وہ متعہ کرنے والوں کو سزا دیں گے۔'

'چند سنی مسلمان اس کی مخالفت اس لیے کرتے ہیں کیونکہ وہ خلیفۂ دوم کی تشریح اور تجویز کی پیروی کرتے ہیں جبکہ شیعہ افراد کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن و سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔'

البتہ نکاحِ متعہ وقتی شادی کا ایک شیعہ طریقہ ہے، تاہم سنی مسلک کے افراد بھی غیر روایتی طرز کی شادیاں کرتے ہیں جن میں مصیار اور عرفی شامل ہیں یعنی نکاح مصیار ایک دوسرے کے حقوق سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور عرفی (عزت میں خلل ڈالنا، بہتان باندھنا)۔

مصیار کے تحت شادی کرنے والے دونوں افراد باہمی اتفاق کے ذریعے ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں اور عُرفی میں لڑکی کے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کیا جاتا ہے۔ تاہم ان دونوں میں مدت کا تعین نہیں کیا جاتا۔

ان غیر روایتی طرز کی شادیوں کے ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کا مقصد ایک سے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی روابط قائم کرنا ہے اور اس طرز کے نکاحوں کو جسم فروشی اور عورتوں کے ساتھ زیادتی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور بے جا اسلامی ڈھال دی جا رہی ہے۔

لندن کے الخوئی سینٹر کے سید الفد ہیل ملانی کہتے ہیں کہ نکاحِ متاع ایک دوسرے کو جاننے کا موقع دیتا ہے۔

بی بی سی کو کئی ایسے واقعات کا پتا چلا ہے جہاں ان غیر روایتی شادیوں کو صرف اور صرف جنسی تعلقات کے لیے مذہبی اجازت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

لندن میں مقیم اور شیعہ اسلام قبول کرنے والے عمر علی گرانٹ نے اب تک تیرہ غیر روایتی شادیاں کیں ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے درست ساتھی کی تلاش کر رہے تھے۔ انھوں نے اس بات کو مانا ہے کہ ان شادیوں کو نکاح سے قبل جنسی تعلقات کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اُن کا کہنا ہے 'اسلام میں جنسی روابط حرام نہیں ہیں۔ اسلام میں جنسی تعلقات کا منفی تناظر نہیں۔ یہ کوئی ناپاک یا بری چیز نہیں۔'

وہ کہتے ہیں 'اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جنسی روابط دو بالغ افراد کے درمیان باہمی اتفاق سے ہونا چاہیے جو کہ ذمہ دار ہوں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ وقتی شادی کی وجہ سے جسم فروشی ہوگی، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ مسلم دنیا میں جسم فروشی ہوتی ہے اور وہ ساری دنیا میں ہوتی ہے۔'

پاکستان پہنچانے کا دھوکا دیکر لاکھوں لوگوں کا قتل

چھ نومبر 1947ء کو قابض بھارتی فوج نے جموں کشمیر کے 123 مسلم اکثریت والے دیہات کے باسیوں کو پاکستان اور آزاد کشمیر لے جانے کے نام پر دھوکہ دے کر شہر سے تین میل دور اکٹھا کر کے اجتماعی قتل کر دیا تھا۔

6 نومبر کے اس واقعے کے عینی شاہد محلہ پیر مٹھا جموں شہر کے مہاجر نور محمد خان کا کہنا ہے کہ 5 اور 6 نومبر کو ساڑھے تین لاکھ جموں وال گاجر مولی کی طرح کاٹ دیے گئے تھے۔

نور محمد خان نے جیو نیوز کے نمائندے سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ ہم مہاراجہ ہری سنگھ کے اعلان پر دھوکے میں آ گئے اور اپنے گھروں سے نکل آئے تھے، ایک کہرام بپا تھا، دو بہنیں مجھ سے بڑی اور بالغ تھیں، ہم نے اُن کے سروں پر دوپٹوں سے پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں کے وہ مرد نظر آئیں۔

انہوں نے مزید بتایا کہ بھارتی قابض فوج جموں وال کی جوان بچیاں اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

آزادی سے پہلے کے دور کو یاد کرتے ہوئے نور خان نے بتایا کہ ہم بچے تھے ہم بندوق نہیں اٹھا سکتے تھے، جب اسکول سے گھر واپس آتے تھے تو گھر میں بستہ رکھ کر باہر گلی محلوں میں نکل جاتے تھے اور دو ہی نعرے لگاتے تھے کہ 'بن کے رہے گا پاکستان، لے کر رہیں گے پاکستان۔'

انہوں نے کہا کہ اب بن گیا ہے پاکستان، ہم بچوں نے بنایا ہے پاکستان، یہ نور محمد کا پاکستان ہے، جس نے 11 سال کی عمر میں بچوں کو اکھٹا کر کے گلی گلی میں پاکستان کے لیے نعرے لگائے تھے۔

مورخین کے مطابق اس قتل عام میں غیر مسلم جموں والوں کو بھی نہیں بخشا گیا، پانچ اور 6 نومبر 1947ء کو چار سے پانچ لاکھ انسانوں کو فوج اور بلوائیوں نے مل کر قتل کیا تھا جبکہ دی لندن ٹائمز کی 10 اکتوبر 1948ء کے شمارے کے مطابق 2 لاکھ 37 ہزار انسانوں کو قتل کیا گیا تھا۔

سری کرشن جی کے سوانح پر تقریر

تحریر: حضرت مولانا غلام رسول راجیکیؒ

منقول ملک محمد صفی اللہ خان

1941ء میں خاکسار مع عزیز مکرم مولوی محمد الدین صاحب مبلّغ البانیہ سرینگر گیا۔ اُن دنوں کشمیری پنڈتوں نے سرینگر میں سری کرشن جی کے متعلق ایک جلسہ کا انعقاد کیا۔ جس میں علاوہ ہندوؤں کے دوسرے مذاہب کے علماء کو بھی تقریر کرنے کی دعوت دی۔ احمدیہ جماعت کی طرف سے خاکسار تقریر کیلئے مقرر ہوا۔ لیکن غیر احمدی علماء کی طرف سے کوئی تقریر نہ ہوئی۔

جلسہ منتظمین نے پروگرام اس طرح وضع کیا کہ غیر مذاہب کے مقررین کی تقاریر پہلے رکھی گئیں تا کہ ان تقاریر میں اگر کوئی حصّہ قابل اعتراض یا لائق جواب ہو تو بعد میں سناتنی ہندوؤں کی طرف سے اس کا جواب دیا جاسکے۔

میری تقریر سب سے پہلے رکھی گئی۔ جب مَیں اپنی نشست گاہ سے اُٹھ کر سٹیج کی طرف گیا تو میری سادگیِ لباس کو دیکھ کر منتظمین جلسہ نے بہت فکر محسوس کیا کیونکہ مسلمانوں میں سے صرف میری ہی تقریر تھی اور میری وضع قطع سے بظاہر جلسہ کی کامیابی نظر نہ آتی تھی۔

مَیں نے سٹیج پر پہنچ کر کلمۂ شہادت اور سورہ فاتحہ پڑھ کر اپنی تقریر شروع کی۔ شروع میں بعض تمہیدی باتیں بیان کیں اور پھر کرشن جی مہاراج کے سوانح حیات کے ظاہری واقعات کے متعلق جو اعتراض کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس کے جواب دیئے۔

مثلاً یہ بتایا کہ کرشن جی ایشور کے مقدس اَوتار اور مقدس ہستی تھے۔ اُن کی طرف بعض باتیں منسوب کر کے جو اعتراض اُن کی ذات اور اخلاق پر کئے جاتے ہیں ۔ وہ حقیقتاً قابلِ اعتراض نہیں ۔ مجوب نگاہیں اُن کو قابلِ اعتراض سمجھتی ہیں۔ در اصل ایسے واقعات اپنے اندر معرفت اور حکمت رکھتے ہیں۔ کرشن جی مہاراج کا گائیوں کو چرانا اور بنسری بجانے کا یہ مطلب ہے کہ گائیوں سے مراد مفید ، کار آمد اور غریب طبع لوگ ہیں۔ اور کرشن جی ایسے لوگوں کی رکھشا کیا کرتے تھے ۔ اور ان کی پرورش کی وجہ سے گئوپال کہلاتے ہیں۔

کرشن جی بنسری سے مراد اُن کی الہامی کتاب گیتا ہے۔ اور بنسری بجانے سے مراد اللہ تعالیٰ کا کلامِ معرفت لوگوں کو سنانا ہے۔ گیتا کا لفظ گیت سے ہی ہے۔ یعنی ایسا کلام جو سریلی آواز سے گایا جاتا ہے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کی الہامی کتاب کا نام زبور رکھا گیا ہے اور زبور اور گیتا کا ایک ہی مفہوم ہے اور قرآن کریم میں وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی (النجم) میں اسی طرح اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ جس طرح بنسری میں سے وہی سُر نکلتی ہے جو بنسری بجانے والا نکالتا ہے۔ اسی طرح خدا کے نبی وہی کلام کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ اُن کی زبان پر جاری کرتا ہے اور اپنی وحی سے ان کو تعلیم کرتا ہے۔

اسی مضمون کو حضرت مولٰنا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

یعنی خدا کے اَوتار اس کی بنسری ہوتے ہیں جن میں خدا تعالیٰ اپنی آواز پھونکتا ہے تو جو لوگ خدا کے وصال کے طالب ہیں اس کی آواز کو سن کر اس کی طرف چلے آئیں اور ہجر اور جدائی کی تکلیف سے بچ جائیں۔

کرشن جی مہاراج کی گوپیوں کے متعلق مَیں نے بیان کیا کہ یہ اعتراض بھی سطحی خیال کے لوگ کرتے ہیں کہ کرشن جی مہاراج نے بڑی تعداد میں گوپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہ استعارہ کی زبان ہے۔ ہر نبی اور پیشوا اپنے ماننے والوں پر اثر ڈالتا ہے ۔ اور اس کی جماعت کے افراد اس کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اور اس افاضہ اور استفاضہ کو استعارہ کی زبان میں مختلف الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی جماعت کو دُنبیاں قرار دیا گیا ہے۔ اور حضرت مسیحؑ کو انجیل میں خدا کا برّہ اور قومِ اسرائیل کو اس کی بھیڑیں کہا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں حضرت نبی کریم ﷺ کو سورہ تحریم میں استعارۃً شوہر کی مثال سے اور تمام مومنوں کو عورتوں کی مثال سے ذکر کیا گیا ہے۔ پس گوپیاں آپ کے مخلص مومنین ہی تھے ۔ جو ہر دم آپ کے نور و

برکت سے استفادہ کر رہے تھے۔

اور یہ واقعہ جو سری کرشن جی کے سوانح میں مذکور ہے کہ آپ گوپیوں کے نہاتے وقت ان کے کپڑے اُٹھا کر درخت پر چڑھ گئے اس میں ایک عارفانہ حقیقت بیان کی گئی ہے۔ کرشن جی نے اپنے مریدوں کو یہ سمجھایا کہ تمہارا اصل لباس جس سے گناہوں کو ڈھانپا جا سکتا ہے۔ وہ تقویٰ اور نیکی کا لباس ہے جو آسمان سے خدا تعالیٰ کے اَوتار کے ذریعہ سے نازل ہوتا ہے خود بخود تمہارے لئے ممکن نہیں کہ تم اس کو حاصل اور اختیار کر سکو۔

قرآن کریم میں بھی ''لباس التقویٰ'' کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ذَالِکَ خَیرٌ کے الفاظ میں اس کی خوبی کا اظہار کیا گیا۔ اور اس واقعہ میں پانی میں نہانے کا جو ذکر ہے اس میں یہ حقیقت ہے کہ جس طرح پانی بدن کی ظاہری میل کچیل کو صاف کرتا ہے۔ اس طرح روحانی پانی یعنی کلامِ الٰہی اور وحی آسمانی قلوب اور باطنی کدورت کو پاک وصاف کرتی ہے۔ اور یہ پانی خدا کے اَوتار یعنی نبی کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ گویا اس واقعہ کے ذریعہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ گناہوں کو ڈھانکنے والا لباس تقویٰ اور گناہوں سے پاک کرنے والا آبِ حیات دونوں خدا تعالیٰ کے اَوتاروں کے ذریعہ ملتے ہیں۔

یہ الزام جو سری کرشن جی پر لگایا جاتا ہے کہ گویا آپ نے مکھن چرایا۔ یہ آپ کے مخالفین کی طرف سے جو ویدوں کے ماننے والے تھے، لگایا گیا ہے۔ یہ بھی ایک ایک مذہبی استعارہ ہے۔ جس کی رُو سے اس علم کو جو خدا تعالیٰ کی کتاب شریعت سے ملتا ہے۔ دودھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور ''طریقت'' کی مثال دہی سے دیتے ہیں۔ اسی طرح ''حقیقت'' ''مکھن'' اور ''معرفت'' خالص گھی ''طریقت'' کہلاتی ہے۔ اور یہ سب دودھ سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح طریقت، حقیقت اور معرفت سب شریعت سے ہی ملتی ہیں۔

جب کرشن جی مہاراج نے ویدوں کی تعلیم کا خلاصہ گیتا کی شکل میں پیش کیا۔ تو وید کے پنڈتوں نے کہا گیتا کا اعلیٰ عرفانی کلام جو لوگوں کو دِل پسند اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگ ویدوں کو چھوڑ کر گیتا کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ دراصل ویدوں کا مکھن ہی ہے جو ویدوں سے چُرا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کرشن جی پر مکھن چُرانے کا الزام عاید کیا گیا لیکن اس سے مراد ظاہری مکھن کی چوری نہ تھی۔ بلکہ ویدوں کی تعلیم کو اخذ کر کے گیتا شامل کرنا تھا۔

کرشن جی کو رُدّر گوپال کے صفاتی نام بھی دیئے گئے ہیں۔ رُدّر کے معنے سؤروں کو قتل کرنے والا اور گوپال کے معنے گؤوں کی پالنا اور رَکھشا کرنے والا ہیں۔ ان الفاظ سے بدوں اور بُرے لوگوں کا نشٹ کرنے والا۔ اور نیک اور فائدہ مند وجودوں کی حفاظت اور پرورش کرنے والا مراد ہے۔ اور گیتا میں کرشن جی نے ایک پیشگوئی بھی فرمائی ہے۔ کہ جب دھرم کی نیستی اور ادھرم کا دَور دَورہ ہوتا ہے۔ تو مَیں اَوتار لیتا ہوں۔ اصل اشلوک کا ترجمہ علّامہ فیضی (جو بادشاہ اکبر کے درباری تھے) نے فارسی کے اس شعر میں کیا ہے

چو بنیادِ دیں سست گردد بسے
نمائیم خود را بشکلِ کسے

جس طرح کرشن جی مہاراج نے پہلی دفعہ اصالتاً اس دُنیا میں آکر نیکوں کی رَکھشا اور بدوں کا ناش کیا ہے۔ اور صحیح دھرم کو قائم کیا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں جب ادھرم اور پاپ کی گھٹائیں دُنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔ کرشن جی صفاتی طور پر حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانیؑ کے رُوپ میں قادیان میں تشریف لائے۔ اور گیتا میں مذکورہ وعدہ پورا ہوا۔

کرشن جی مہاراج کے بروز اور مثیل بھی وہی کام کر رہے ہیں۔ جو کرشن جی خود کیا کرتے تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے پرماتما کا سچا دھرم دُنیا میں قائم ہو رہا ہے۔ اور پاپ اور ادھرم مٹ رہے ہیں۔

یہ تقریر خدا تعالیٰ کی خاص تائید ونصرت سے بہت مقبول ہوئی اور حاضرین نے دورانِ تقریر میں بار بار چیئرز دیئے اور مسرت کا اظہار کیا۔ اور وہ لوگ جو میری سادہ وضع اور لباس کو دیکھ کر مایوسی کا اظہار کر رہے تھے۔ احمدیہ جماعت کے ایک حقیر خادم کی کامیاب تقریر سے حیرت میں آ گئے۔

❁❁❁

اشتہارات کے لئے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر کر سکتے ہیں معلومات کے لئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youtube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے تمام معلومات اس رسالہ میں موجود ہیں شکریہ

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeHoUBFhMYw

گوشۂ ادب

اہلِ فارس کی فکری وعملی میراث اور علامہ اقبال

لاہور انٹرنیشنل نیوز ڈیسک

علامہ اقبالؒ کی ہمہ گیر شخصیت اور افکار پر روز افزوں کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔فکرِ اقبال نے جہاں لوگوں کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں وہاں اس سلسلے میں عاشقانِ اقبالؒ کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔

اقبالیاتی ادب میں کتب کی اشاعت فروغِ فکرِ اقبال میں ایک خاطر خواہ اضافہ ہے۔اقبالیات کوفروغ دینے میں کتب کی اشاعت کا یہ سلسلہ کماحقہ' اس بات کی دلیل ہے کہ علامہ اقبال کی فکر عالمگیریت و ہمہ جہت ہے۔ اقبالیاتی ادب میں بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں کتب شائع ہوئیں لیکن اُن میں بہت کم کتب نے پڑھنے والوں پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب ’’اھلِ فارس کی فکری وعملی میراث اور علامہ اقبال‘‘ بھی ہے۔ اپریل 2018ء میں اس کتاب کی طباعتِ سوم منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے مصنف پروفیسر ڈاکٹر بریگیڈیئر(ر) وحید الزمان طارق ہیں۔

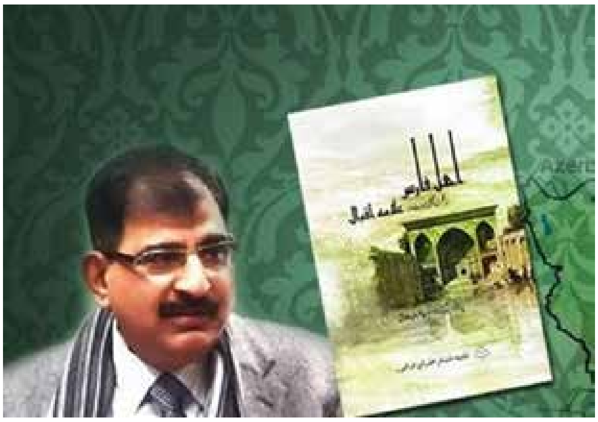

وحید الزمان صاحب نے پاکستان کی مسلح افواج میں اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور علم کے مزید حصول کی خاطر اُنھوں نے اپنے اس سفر کو جاری رکھا۔ ڈاکٹر وحید الزمان نے ایران سے فارسی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے فارسی ادب اور ایرانی تاریخ کا جس گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ موجودہ دور میں اقبال شناسی میں فارسی ادب پر جو دسترس انہیں حاصل ہے وہ کسی اور ماہر اقبالیات کے ہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کا ثبوت اُن کی اس کتاب کے مطالعہ سے بھی عیاں ہے۔

’’اہلِ فارس کی فکری وعملی میراث اور علامہ اقبالؒ‘‘ کے ابواب کی فہرست پر اگر نظر ڈالی جائے تو اسے چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ قدیم اسلام سے قبل قدیم فارس کی تاریخ' دوسرا حصہ اسلام کی آمد کے بعد فارس پر اُس کے اثرات' تیسرا حصہ اسلام کے بعد کا ایران اور آخری حصہ علامہ اقبالؒ اور ایران ہے۔مصنف نے ان موضوعات کو تیرہ ابواب میں قلم بند کیا ہے جس میں ہر موضوع کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ فارس کی تاریخ اور اس موضوع پر جس گہرائی سے مصنف نے قلم اُٹھایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کیوں کہ فارس کی تاریخ پر ہمیں کتب تو بے شمار دستیاب ہیں لیکن قدیم فارس کی ادبی روایات' تاریخ' جغرافیہ اور دیگر ایسے مختلف موضوعات، جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق فکرِ اقبال سے ہو' ایسی معلومات خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

مصنف اُن تمام موضوعات کو زیر بحث لائے ہیں جن کو پڑھ کر ایک عام قاری فارسی ادب کی اُن اصطلاحات، استعارات و اشارات سے بخوبی واقفیت حاصل کر لیتا ہے جو کلامِ اقبال میں جابجا ملتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک ہم فارسی ادب کے ان گوشوں سے آشنائی حاصل نہیں کریں گے ہم پر کلامِ اقبال کا واضح ہونا دشوار ہو گا۔ کتاب کا دوسرا حصہ بھی اپنی مثال آپ ہے اس میں مصنف نے اسلام کی آمد کے بعد قدیم فارس پر اُس کے اثرات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ یہ حصہ اس لیے بھی اہم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث و واقعات یہاں پیش کیے گئے ہیں جن کا براہِ راست تعلق فارس کی قدیم تہذیب وتمدن اور تاریخ سے ہے۔ اقبالیاتی ادب میں ایسی مثال شاید ہی پہلے کہیں دیکھنے میں ملی ہو۔ اس کے بعد کتاب میں اسلام کے بعد کا ایران پیش کیا گیا ہے۔ اس میں موجودہ ایران کی تاریخ، ثقافت و تہذیب کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ جدید فارسی ادب کے بہت سے گوشے مصنف ہمارے سامنے اُجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ جامعیت کے ساتھ قدیم وجدید فارس کے تاریخی و ادبی' ثقافتی و تہذیبی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے بعد مصنف نے علامہ اقبال کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ جب ہم علامہ اقبال کے ایران اور فارسی ادب کے ساتھ لگاؤ تک پہنچتے ہیں، ہم پر اُس کا پس منظر مصنف فصیح و بلیغ انداز میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی نظر میں فارس کی جو اہمیت ہے اُس کا اندازہ اُن کی بیاض کے اس مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ اسلامی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ کونسا ہے تو میں بلا ہچکچاہٹ کہوں گا 'فارس کی فتح'۔ نہاوند کی لڑائی نے عربوں کو نہ صرف ایک خوبصورت ملک دیا بلکہ ایک ایسی قدیم تہذیب دی یا زیادہ بہتر طور پر یوں کہنا چاہیے کہ ایسی قوم سے آگاہی دی جو سامی اور آریائی مواد سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے سکتی تھی۔ ہماری اسلامی تہذیب سامی اور آریائی تصورات کی باہمی پیوند کاری کی پیداوار ہے۔ یہ ایسے نوعمر کی طرح ہے جس کو دھیما پن اور شائستگی اس کی آریائی ماں سے اور پختہ کردار اس کے سامی باپ سے ترکے میں ملا۔ لیکن فارس کی فتح کے بغیر اسلامی تہذیب یک طرفہ رہ جاتی۔ فارس کی فتح سے ہمیں وہی کچھ ملا جو کہ رومیوں کو یونان کی فتح سے ملا تھا"۔

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا بیان سے اس کتاب کی اہمیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ فارس کی تاریخ وتمدن' ثقافت وادب سے آگاہی اقبالیات کے دلدادہ قارئین کے لیے کس قدر اہم ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مصنف نے آسان اور سادہ زبان استعمال کی ہے۔ فارسی زبان کی اہمیت تو علامہ اقبال کی نثر و شاعری میں واضح ہے۔ جیسا کہ خود انھوں نے فرمایا تھا کہ:

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں کبھی ایران کا سفر نہیں کیا لیکن اُنہیں اپنے عہد کے ایران کے حالات و واقعات اور ملّتِ ایران کی زبوں حالی کی بابت کس قدر معلومات تھیں، اس ضمن میں بھی مصنف نے خوب قلم آزمائی کی ہے۔ کتاب ہذا کا پیش گفتار اور ابتدائیہ بھی اپنی اہمیت کا حامل ہے جس میں مصنف نے نہ صرف اُن محرکات کا ذکر کیا ہے جن کی بنیاد پر کتاب تحریر کی گئی بلکہ اہلِ فارس کا مختصر تجزیہ بھی پیش کیا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جس انداز سے مصنف نے اہل فارس اور ایران کا پس منظر پیش کیا ہے اس حوالے سے یہ کتاب علامہ اقبال کے چاہنے والوں کے ذہنوں پر گہرے نقوش ثبت کرے گی۔ اس کتاب کو "مکتبہ خدام القرآن، لاہور" نے شائع کیا ہے۔

کراچی مسائل کا گڑھ بن گیا، سڑکیں بیٹھنا شروع

حکمرانوں کی بے حسی اور شہر کے ساتھ بے رخی کے باعث کراچی مسائل کا گڑھ بن گیا ہے، پہلے شہری کچرے کو رو رہے تھے مگر اب سڑکیں بھی دھنسنا شروع ہوگئی ہیں۔

کراچی کے ریڈ زون علاقے میں دو دن کے دوران دو سڑکیں بیٹھ گئی ہیں، پہلے کلب روڈ اور اب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ پر سڑک دھنس گئی۔

وزیر اعلیٰ ہاؤس کے سامنے دو ماہ قبل بھی سڑک بیٹھی تھی اور اب دوبارہ وہی سڑک پھر بیٹھنے سے گڑھا پڑ گیا ہے۔

گذشتہ کئی سال سے کراچی لاوارث بنا ہوا ہے اور مسائل کا گڑھ بھی نظر آتا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس شہر کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

پہلے کچرا شہر کراچی عروس البلاد کی زینت بنا، پھر شہری ڈینگی مچھر اور خونخوار آوارہ کتوں کے ساتھ لڑتے رہے۔

ابھی شہریوں کی ان میدانوں میں زور آزمائی جاری تھی اور کراچی والے پیش قدمی کرتے آگے بڑھ رہے تھے کہ ریڈ زون کے قریب آتے آتے منہ کے بل گرنے لگے، دیکھا تو سڑکیں دھنسی ہوئی تھیں جبکہ ریڈ زون اور اطراف میں تمام اہم شاہراہیں گندے پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں اور بے ناک کی انتظامیہ اس میں غوطے لگا رہی ہے۔

وزیر اعلیٰ ہاؤس ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ پر واقع ہے اور اس سڑک کو ایک سال قبل کروڑوں روپے لاگت سے تعمیر کیا گیا لیکن یہ سڑک دو ماہ قبل سیوریج کی لائن بیٹھ جانے کی وجہ سے متاثر ہوئی اور پھر اس کی مرمت اور لائن کی مرمت پر کروڑوں روپے خرچ ہوئے اور آج پھر یہ ایک گہرے گڑھے میں بدلی دکھائی دے رہی ہے جس کی وجہ سے ٹریفک کی روانی شدید متاثر ہے۔

تین روز قبل کلب روڈ سے عبداللہ ہارون روڈ جانے والی سڑک زیر زمین سیوریج کی لائن بیٹھ جانے کے باعث تباہ ہوگئی اور وہاں کئی فٹ چوڑا گڑھا پڑ گیا تاہم سڑک پر مرمت کا کام جاری ہے جو رواں ہفتے کے اختتام تک مکمل کرلیا جائے گا، یہ سڑک کئی کروڑ روپے کی لاگت سے حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔

ایم ڈی واٹر بورڈ اسد اللہ خان کا کہنا ہے کہ زیرِ زمین لائن پچاس سال پرانی تھی جس کے باعث یہ واقعہ رونما ہوا۔

دوسری طرف صدر میں راجہ غضنفر علی روڈ جو کراچی کنٹونمنٹ کی ذمہ داری ہے وہ کسی تالاب کا منظر پیش کر رہی ہے، جبکہ صدر سے شاہراہ فیصل جانے والی عبداللہ ہارون روڈ پر بھی پانی ہے اور جب یہ سارے مسائل مل جاتے ہیں تو شہر میں ٹریفک جام ہوجاتا ہے اور عوام رل جاتے ہیں۔

مشاعرے، تالیاں، سیٹیاں اور آپ کا شعری ذوق

لاہور انٹرنیشنل نیوز ڈیسک

پچھلے کچھ عرصے سے عوام الناس کی شعری بد ذوقی کا رونا رویا جا رہا ہے۔ پہلے کچھ لوگوں کا یہ ذاتی رنج تھا کہ شاعری کے نام پر کچھ لوگ تُک بندیاں کر رہے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ عامۃ الناس، جن میں بڑی تعداد طلبا و طالبات کی ہے، اس شاعری کو نہ صرف حقیقی شاعری سمجھ کر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہیں بلکہ شعر پر تالیاں اور سیٹیاں بجا کر داد بھی دے رہے ہیں۔

اس پر یوسفی صاحب یاد آ گئے۔ فرماتے ہیں، ”مجھے اس بات پر قطعی حیرت نہیں ہوتی کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی خونی پیچش کا علاج تعویذ گنڈے سے کرتے ہیں، بلکہ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ سچ مچ اچھے ہو جاتے ہیں۔“

یہ بلاگ بھی پڑھیے: تمہاری شاعری کیا ہے بھلا

اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یار لوگوں کو غصہ کس بات پر ہے؟ نوجوان نسل کا شعری ذوق خراب ہونے پر؟ علی زریون کے 'کس نے جینز کری ممنوع' پر یا مشاعرے میں تالیاں اور سیٹیاں بجانے پر؟

فریحہ نقوی نے اسی دکھ پر کہا تھا

آہ اگر نہ بھر سکیں تو واہ سے کام لیجیے
شعر پہ سیٹیاں نہیں درد پہ تالیاں نہیں

اب اس منظر نامے پر ہمیں بادی النظر میں دو اعتراضات نظر آتے ہیں: پہلا تو یہ کہ کچھ لوگ شاعری کے نام پر تُک بندی کر کے نوجوانوں کا شعری ذوق خراب کر رہے ہیں؛ اور دوسرا اعتراض یہ کہ شاعری کے نوجوان مداح مشاعروں میں تالیاں اور سیٹیاں بجا کر داد دے رہے ہیں۔ یعنی جو مشاعرے کی روایات ہوا کرتی تھیں کہ شعر پر واہ واہ، سبحان اللہ، کیا کہنے یا مکرر ارشاد کا غلغلہ بلند ہوا کرتا تھا، اب وہ نہیں رہا بلکہ میوزیکل کنسرٹس کی طرح لوگ شاعری پر تالیاں پیٹ رہے ہیں اور سیٹیاں بجا رہے ہیں جیسے سینما ہال میں آئٹم سانگ پر تماش بین سیٹیاں بجاتے ہیں۔

سینما میں فلم بینی کے دوران آئٹم سانگ پر تالیوں کے بجائے سیٹی بجانے کی ایک وجہ تو یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی... اور سیٹی بغیر ہاتھ کے بھی بجائی جا سکتی ہے۔

پرانے زمانے میں جب کبھی تہذیب نامی کوئی چیز سماج میں پائی جاتی تھی، اس وقت مشاعرے میں تالی بجانے کا مطلب ہوٹنگ سے بھی بڑی کوئی چیز ہُوا کرتا تھا؛ یعنی بے عزتی اور رسوائی سے بھی بڑی کوئی چیز کہ جناب ان کی تو رات مشاعرے میں تالی پِٹ گئی۔

تالیاں پیٹنا ہیجڑوں کا ہُنر ہے۔ وہ بات بے بات تالی پیٹ کر اپنی بات مکمل کیا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک داد و تحسین کا مطلب بھی تالی پیٹنا ہے اور دوسروں کی ہرزہ سرائی کا مطلب بھی تالی پیٹنا ہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ لعنت بھیجنے کا کام بھی تالی سے ہی لیا کرتے ہیں۔

خیر! بات ہو رہی تھی نئی شاعری اور نئے منظر نامے کی۔

عوام کے شعری ذوق کی بدحالی کا رونا رونے والے بظاہر دو باتوں پر اعتراض کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری کے نام پر کچھ لوگ تُک بندیاں کر رہے ہیں اور اردو ادب کی تہذیب و روایات سے نابلد انگریزی میڈیم کے پڑھے لکھے نوجوان سامعین، مشاعروں میں تالیاں اور سیٹیاں بجا کر اس تُک بندی پر داد دے رہے ہیں۔

اگر اسی مؤقف پر ذرا غور کیا جائے تو اس کے اندر ایک اور اعتراض بھی چھپا نظر آتا ہے کہ شاعری کے نام پر تُک بندی کرنے والے نوجوان نسل کا شعری ذوق بھی خراب کر رہے ہیں۔

چلیے، مان لیتے ہیں کہ یہ سب ہو رہا ہے۔ تو بات اب یہ ہے کہ کیا یہ نوجوان شاعر ہی اس سارے معاملے کے ذمے دار ہیں؟ یا کوئی خرابی ہے جو برسوں سے کہیں چھپتی چھپاتی چلی آ رہی تھی اور اب سوشل میڈیا کے دور میں آ کر پوری طرح عیاں ہو گئی ہے؟

دبستان کراچی کے ایک شاندار شاعر اور ہمارے مرحوم دوست عزم بہزاد نے جب ایک نظم ”خرابی“ کے نام سے لکھی اور بتایا کہ سامنے نظر آنے والی خرابی اسی وقت کی پیداوار نہیں ہوتی جب وہ اجاگر ہوتی ہے، بلکہ اس کے پیچھے برسوں کا تسلسل ہوتا ہے۔ بس کسی خاص وقت میں آ کر وہ آپ کے سامنے اپنا آپ پوری طرح عیاں کر دیتی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ خرابی شاید لمحہ موجود میں پیدا ہوئی ہے۔

خرابی (نظم، عزم بہزاد)

خرابی کا آغاز کب اور کہاں سے ہُوا
یہ بتانا ہے مشکل
کہاں زخم کھائے
کہاں سے ہوئے وار

یہ بھی دِکھانا ہے مشکل
کہاں ضبط کی دھوپ میں ہم بکھرتے گئے
اور کہاں تک کوئی صبر ہم نے سمیٹا
سنانا ہے مشکل
خرابی بہت سخت جاں ہے
ہمیں لگ رہا تھا یہ ہم سے اُلجھ کر کہیں مر چکی ہے
مگر اب جو دیکھا تو یہ شہر میں،
شہر کے ہر محلے میں، ہر ہر گلی میں،
دھوئیں کی طرح بھر چکی ہے
خرابی رویوں میں،
خوابوں میں، خواہش میں،
رشتوں میں گھر کر چکی ہے
خرابی تو لگتا ہے
خوں میں اثر کر چکی ہے
خرابی کا آغاز
جب بھی، جہاں سے ہُوا ہو
خرابی کے انجام سے غالباً
جاں چھڑانا ہے مشکل

تو اب جن لوگوں کو اس بات پر اعتراض ہے کہ نوجوانوں کا شعری ذوق خراب کیا جارہا ہے، ان سے بندہ پوچھے کہ بھائی آپ نے نوجوانوں کی افزائشِ ذوق کے لیے کون سے گھوڑے دوڑائے تھے؟

یہ بدنظر بزرگ جو اب شور مچا رہے ہیں، انہوں نے پچھلے 50 سال سے ایک ہی نعرے کا دامن پکڑا ہوا کہ ادب روبہ زوال ہے۔ ہمارے بال سفید ہو گئے، بچے بڑے ہو گئے، جب سے ہم یہ نعرہ سُن رہے ہیں کہ جی اردو ادب روبہ زوال ہے، اردو میں کوئی اچھا ناول نہیں لکھا گیا، اردو والوں کو تنقید کی تمیز نہیں، اردو افسانہ بدحال ہے۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے آخری اردو ناول کب پڑھا تھا تو محترم اداس نسلیں اور آگ کا دریا سے آگے نہیں بڑھتے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعری بھی ہو رہی ہے، تنقید بھی لکھی جارہی ہے اور ناول بھی سامنے آرہے ہیں۔ اچھے برے کا فیصلہ وقت کرے گا۔

کون تاریخ میں زندہ رہتا ہے اور کون نہیں رہتا، یہ طے کرنا ہمارا اور آپ کا کام نہیں۔ہمیں اپنے کام پر دھیان دینا چاہیے۔

غالب ہی نے جیسے کہا
نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تو کون جانے غالب نے کس دکھ میں اور کس دل سے یہ بات کہی ہو گی۔

اُس وقت کس نے سوچا ہو گا کہ دو سو سال بعد غالب کا جشن منایا جارہا ہو گا اور جو لوگ غالب پر اعتراض کرتے ہیں، ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہو گا۔

اپنی نوجوان نسل کے شعری ذوق کی آبیاری کرنے کی ذمے داری پڑھنے والوں سے زیادہ پڑھانے والوں کی ہے، مگر ایسے بہت سے لوگ ہیں جو مختلف تعلیمی اداروں میں پڑھاتے ہیں اور شاعر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں مگر ان کی اپنی شاعری انتہائی بودی ہے۔تو وہ اپنے طلبا کا شعری ذوق کیا بلند کریں گے؟

ہم نے تو اس ملک کے سوائے ایک دو کے کسی سیاستدان کو وزن میں شعر پڑھتے نہیں دیکھا، تو عام طلبا و طالبات سے آپ کیا توقع رکھیں گے؟

اب تو سوشل میڈیا کی کرامت نے بے وزن اور بے بحر شاعروں کی بھی فین فالوئنگ بنادی ہے اور بہت سے لوگ اس میں خوش بھی ہیں۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں، اور سَو باتوں کی ایک سیدھی بات بھی یہ ہے کہ جب اصل اور جینوئن لوگوں کا حق مارا جائے گا تو خدا آپ پر نااہل لوگوں کو مسلط کر دے گا۔ یہ کائناتی اصول ہے اور اسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔

جہاں مشاعروں میں ایک طرف یہ اشعار ہوں:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

یا

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

اور دوسری طرف کوئی شاعر یہ اشعار پڑھے:

اک روز میں بھی باغِ عدن کو نکل گیا
توڑی جو شاخِ رنگ فشاں ہاتھ جل گیا
دیوار و سقف و بام نئے لگ رہے ہیں سب
یہ شہر چند روز میں کتنا بدل گیا
مَیں سو رہا تھا اور مری خواب گاہ میں
اک اژدھا چراغ کی لو کو نگل گیا

تو ایمانداری سے بتایئے کہ لوگ کس پر داد دیں گے؟

ظاہر ہے پھر فراز اور پروین شاکر ہی مشہور ہوں گے اور ثروت حسین کو کوئی اگلے مشاعرے میں نہیں بلائے گا کیونکہ مشاعرے کے لوگوں کو نہ تو بام و سقف سمجھ میں آتے ہیں اور نہ شاخِ رنگ فشاں کا تلفظ ادا ہونا ہے۔تو ثروت حسین جیسا شاندار شاعر اس مشاعرہ بازی کی سیاست کی نذر ہو جاتا ہے اور سطحی قسم کے شاعر نوجوان نسل کے نمائندہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

❀❀❀

اردو زبان ...... تا ابد پائندہ باد

لاہور انٹرنیشنل نیوز ڈیسک

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اردو زبان میں حلاوت ، وسعت، معنویت اور انسانی جذبات واحساسات سے ہم قدم رہنے کی جملہ صفات بدجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ داغؔ دہلوی کو اس شاعرانہ مبالغہ آرائی کی جسارت ہوئی۔

احمد پاکؐ کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن بھی آتا ، بزبانِ اردو

اردو برصغیر ہندوپاک کی واحد زبان ہے جو درۂ خیبر سے چاٹگام اور میانمار سے قلات تک مروج ہے۔عرب دنیا اور لندن، امریکہ اور یورپ میں بھی اس کے چرچے ہورہے ہیں۔ یہ ہر معنی میں ایک مقبول عام زبان ہے جس کی اپنی ایک شیریں تہذیب وتاریخ ہے۔اگرچہ اس زبان کے حروف تہجی سے لے کر جملوں کی بناوٹ، تذکیر وتانیث اور واحد جمع تک اپنے منفرد قواعد وضوابط ہیں، لیکن عربی، فارسی اور پراکتوں نے اس زبان کے کاکل سنوارنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔ عربی زبان کی خوشبوئیں محمد بن قاسم کے مابعد براستہ سندھ گجرات اس عوامی زبان میں جذب ہوئیں اور فارسی کی لذتیں محمود غزنوی کے ذریعے شمالی ہند تک پھیل کر اردو کے دامنِ ارتقاء کو وسیع تر کر گئیں۔یہ دونوں زبانیں اس نئی نویلی بولی کو گنگا جمنا کے دوآبے میں لے گئیں تو ایک نئی شاندار لسانی اثاثے کی دریافت ہوئی۔ آگے جب دلی مسلم حکمرانوں کی قلمرو میں آگئی تو اردو عربی، فارسی اور پراکرتی بولیوں کے حسین سنگم سے ایک مخلوط مگر حسنِ آہنگ سے معمور اردو زبان معرض ِ وجود میں آئی جو بہت جلد بادِ بہاری کی صورت میں مختلف ثقافتوں،افکار،مذاہب، عقائد ، مزاجوں میں خود کو ڈھال کر جابجا اظہار کی کونپلیں اور بیان کے شگوفے پھوٹنے کا باعث بنی۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے اردو منظومات سے لے کر حضرت سید محمد خواجہ بندہ گیسو درازؒ کی ”معراج العاشقین“ اور قلی قطب شاہ اور عادل شاہی دور تک اس زبان نے شباب بھری انگڑائیاں لیں، پھر محمد عطا حسین خان تحسینؔ اور میر امنؔ سے لے کر غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور فراقؔ تک اردو نے زمانے کے لسانی تقاضوں، ادبی پیرایوں اور ندرتِ اظہار کو اپنی آغوش میں لیا، یہاں تک کہ جب تحریک آزادیٔ ہند کا بگل بجانے کے لئے تاریخ کو کسی میٹھی رسیلی عوامی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی تو قرعۂ فال اردو کے نام ہی نکلا۔اردو نے انقلاب زندہ باد کا نعرۂ مستانہ دے کر اپنی نغمگی وتازگی سے مردہ دلوں میں انقلاب کی اُمید جگائی اور خفتگانِ ہند میں بیداری کا خون دوڑایا مگر افسوس صد افسوس سنتالیس کے ناگفتہ بہ حالات میں اردو کیا یک بدنگاہی اور کج دماغی کی بھینٹ چڑھائی گئی۔یوں میرؔ وغالبؔ اور منشی پریم چند کی مشترکہ میراث کو تعصب اور تنفر کے صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔بہت سارے متعصب جفا کاروں نے اردو زبان کے ساتھ خدا واسطے بیر میں اس زبان سے بدسلوکیاں روا رکھیں کہ ان کرم فرمائیوں کے نتیجے میں ستر سال سے یہ زبان اپنی ہی جنم بھومی میں سرد مہری، اجنبیت اور فرقہ پرستانہ سوچ کے بیچ اپنی بقاء کی جنگ تن تنہا لڑتی چلی جارہی ہے۔بقاء کی اس جنگ کی معجزہ نمابات یہ ہے کہ اردو یہ جنگ بے سروسامانی کی حالت میں اکیلے کامیابی کے ساتھ لڑ رہی ہے ۔ اس دوران اپنی بے مروتی اور احسان فراموشی کو چھپانے کے لئے تنگ نظر ومتعصب لوگوں نے اس زبان کو مذہب کا لبادہ پہنا کر اس کے خلاف جاہلانہ الزمات کی یورشیں جاری رکھی مگر یہ اردو کی سخت جانی ہے کہ ان آندھیوں میں بھی یہ زبان گیتوں ، غزلوں ، فلمی نغموں، افسانوں، فلمی مکالموں، مشاعروں اور درسی کتابوں کی صوت میں زندگی کی سانسیں لے رہی ہیں۔یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہماری ریاست میں بھی اردو کے ساتھ برس ہا برس سے سوتیلی ماں کا سلوک روا رکھا جارہا ہے۔افسوس کہ اس بدسلوکی سے اردو زبان کو بچانے کے لئے ریاست میں کوئی ایسی سنجیدہ ادبی ولسانی تحریک برپا ہی نہ ہوئی جو اردو ادیبوں، دانش وروں، شعرائے کرام اور صحافیوں کو کسی ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے جوڑ کے چلتی جو اردو کو اپنا آئینی حق دلانے پر منتج ہوتی۔

آج کی تاریخ میں ریاست میں ایک ایسی علمی وادبی اردو نواز تحریک کے لئے میدان ہموار ہے مگر اس کے لئے کوئی فرہاد ومجنون بن کر سامنے تو آئے۔اردو کی کمزوری کا مطلب ہے ریاست کی جغرافیائی اکائیوں کی لسانی وحدت کا خطرے میں پڑجانا۔اس لئے دفاعِ اردو کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کا ہونا پہلے سے کئی زیادہ وقت کی پکار ہے ۔ اردو کی ترویج و ارتقاء کے لئے اس زبان کے پرستاروں پر لازم ہے کہ وہ اول خلوصِ دل اور عزمِ صمیم کے ساتھ اس زبان

کے تئیں اپنا بے لوث اور فعال رول ادا کریں، دوم ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے باجود یہ زبان جس عدم توجہی اور حوصلہ شکنی کی تختۂ مشق بنی ہے، اس کا موثر سد باب کرنے کی کاوشیں کریں، سوم یہ لوگ اقتدار واختیار کی مسند پر بیٹھے لوگوں کو بہ دلائل سمجھائیں کہ ریاست کے تینوں خطوں کو جوڑنے والی زبان اردو ایک قومی اثاثہ ہے جس سے ہی ہماری وحدت اور باہمی مودت مشروط ہے، لہٰذا اس زبان کی ناقدری کو ترک کیا جانا چاہیے، چہارم اس زبان کے تئیں عوام میں جو احساسِ کمتری پایا جاتا ہے، اس کا قلع قمع کرنے کے لئے موثر اور کارگر اقدامات کئے جانے چاہیے تا کہ خدانخواستہ اردو کا حشر بھی ریاست میں فارسی جیسانہ ہو، پنجم اردو کاز کے لئے وقف متوالوں کی غایت اولیٰ یہ ہونی چاہیے کہ وہ نہ صرف اردو دنیا کی معروف شخصیات کی تخلیقات اور ادبی کاوشوں سے لوگوں کو مستفید ہونے کی ترغیب دلائیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اردو کے نئے فرہادوں اور جدید تیشوں کو تلاشنے کے لئے قلمے قدمے درمے معاونت کریں۔ ششم اردو زبان کی ترقی وکمال کے لئے سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیوٹ سیکٹر میں ارود زبان کے ڈگری یافتہ طلبہ وطالبات کے لئے روزگار کے مواقع ڈھونڈ نکالنے کی تحریک چلائیں۔ ان اہداف کے ساتھ اگر اردو کے بہی خواہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں سنجیدہ کام کریں گے تو ریاست میں اردو کے دوام وبقاء کا خواب ایک ٹھوس حقیقت کا روپ دھارن کرسکتا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں وقت وقت پہ اردو کے تحفظ وبقاء کے نام پر بہت ساری اردو انجمنیں قائم ہوئیں مگر ان میں یا توخلوص کا فقدان رہا یا استقامت کی کمی ،اس لئے یہ بہت جلد ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھ کر کاغذی گھوڑے ثابت ہوئیں۔ بایں ہمہ مقامِ شکر ہے کہ اردو سے وابستہ زیادہ تر ادیب اور قلم کار اخلاص سے بہرہ مند ہیں، وہ لسانی تعصّبات اور گروہی مفادات سے بالاتر ہوکر اردو کی ترویج واشاعت چاہتے ہیں۔

اردو کے لئے یہی محبت وخلوص مثل تریاق ہے جس سے اردو تہذیب کا احیاء نو اور اس زبان کی مقبولیت، پذیرائی اور بے پناہ محبتوں کا اُجالا ممکن ہے۔ اُمید کی جانی چاہیے کہ اردو کاز سے دلی رغبت رکھنے والے تمام محبانِ اردو مل جل کر بقائے اردو کے مشترکہ کاز کے لئے ہمہ تن مصروفِ عمل ہوجائیں گے۔

شعروشاعری

غزل

سید سمیع الحسن شاہ حجازی

چلو ہم پیار بانٹیں
گل و گلزار بانٹیں
حوالے چاہتوں کے
سر بازار بانٹیں
جو محور امن کا ہو
وہ اک کردار بانٹیں
بسا لیں ایسی دنیا
در و دیوار بانٹیں
زمانہ غم بھی دے تو
خوشی ہر بار بانٹیں
بنے دھرتی یہ جنت
ہم اتنا پیار بانٹیں
سفر خوشبو ہو اپنا
تو لالہ زار بانٹیں
کسی سے نہ ڈریں ہم
لب اظہار بانٹیں
حجازی گل وفا کے
ہزاروں بار بانٹیں

غزل

سید طاہر احمد زاہد

انہی وحشتوں میں رہا کیا کریں
سلگتی ہوں انکھیں دعا کیا کریں

وہ تھا ایک پتھر کہ پوجا جسے
اسے پھر بنا کر خدا کیا کریں

بھلانے کا کوئی ہو ساماں مگر
خود سے ہی خود کو جدا کیا کریں

ملی جب ہو تنہائیوں کی سزا
زمانے کی کوئی سزا کیا کریں

مقدر میں لکھا تھا وہ ہی ملا
زاہد خدا سے گلہ کیا کریں

غزل

فقیر بشارت خان

یہ دل کے موسم بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں
کچھ لوگ دور رہ کر بھی کتنے قریب ہوتے ہیں

مقدر میں تھا جو ملا ہے، پھر کس بات کا گلہ ہے؟
محبتوں کے بھی اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں

ہر دم بکھیرتے ہیں خوشیاں جو چار سو
کاندھوں پہ لیکن اپنے اٹھائے صلیب ہوتے ہیں

ان آنسوؤں کی اپنی کوئی زبان تو نہیں ہے لیکن
لگ جائیں اگر یہ بہنے تو بلا کے خطیب ہوتے ہیں

جنھیں خلوت جاناں میں اک شام ہو میسر
بشارت وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں

ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں سے حسن سلوک

لاہور انٹرنیشنل نیوز ڈیسک

دنیا میں اکثر لوگ جب بالغ ہوجاتے ہیں اور بیوی بچوں کے فکر اُنہیں لگ جاتے ہیں تو ماں باپ سے حسن سلوک میں کمزوری دکھانے لگ جاتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ اس نقص کو دور کرنے کیلئے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت کو بار بار واضح فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے کہا یَا رَسُوْلَ اللہ! میرے حسن سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تیری ماں۔ اس نے کہا پھر؟ آپ نے فرمایا۔ پھر بھی تیری ماں۔ اُس نے کہا یَا رَسُوْلَ اللہ! اِس کے بعد؟ آپ نے فرمایا۔ اس کے بعد بھی تیری ماں۔ اُس نے چوتھی دفعہ کہا یَا رَسُوْلَ اللہ! اس کے بعد؟ تو آپ نے فرمایا۔ پھر تیرا باپ۔ پھر جو اس کے بعد رشتہ دار ہوں پھر جو ان کے بعد رشتہ دار ہوں؟

(بخاری کتاب الادب باب من احق الناس بحسن الصحبة)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ تو آپ کے بچپن میں ہی فوت ہوگئے تھے، بیویوں کے بزرگ موجود تھے اور آپ ہمیشہ اُن کا ادب کرتے تھے۔ جب فتح مکہ کے موقع پر آپ ایک فاتح جرنیل کے طور پر مکہ میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ اپنے باپ کو آپ کی ملاقات کے لئے لائے۔ اُس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا۔ آپ نے ان کو کیوں تکلیف دی میں خود اِن کے پاس حاضر ہوتا۔

(سیرت ابن ھشام جلد۴ صفحہ۴۸ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء)

آپ ہمیشہ اپنے صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے بوڑھے ماں باپ کا زمانہ پائے اور پھر بھی جنت کا مستحق نہ ہوسکے، تو وہ بڑا ہی بدبخت ہے۔

(مسلم کتاب البر و الصلة باب رغم من ادرك ابويه الخ)

مطلب یہ کہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت انسان کو اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا اتنا وارث بنادیتی ہے کہ جس کو اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کا موقع مل جائے وہ ضرور نیکی میں مستحکم اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا مستحق ہوجاتا ہے۔

ایک شخص نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یَا رَسُوْلَ اللہ! میرے رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں اُن سے نیک سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان سے احسان کرتا ہوں اور وہ مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔ میں اُن کے ساتھ محبت سے پیش آتا ہوں اور وہ مجھ سے ترش روئی سے پیش آتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو پھر تو تمہاری خوش قسمتی ہے کیونکہ خدا کی مدد تمہیں ہمیشہ حاصل رہے گی۔

(مسلم کتاب البر و الصلة باب صلة الرحم و تحریم قطیعتها)

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ و خیرات کی نصیحت فرما رہے تھے تو آپ کے ایک صحابی ابوطلحہؓ انصاری آئے اور اُنہوں نے اپنا ایک باغ صدقہ کے طور پر وقف کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اِس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا بہت عمدہ صدقہ ہے، بہت اچھا صدقہ ہے۔ بہت اچھا صدقہ ہے۔ پھر فرمایا۔ لو اب تو تم اسے وقف کر چکے۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ تم اس کو اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دو۔ (بخاری کتاب التفسیر باب لن تنالوا البر الخ)

ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور اُس نے کہا۔ یَا رَسُوْلَ اللہ! میں آپ سے ہجرت کی بیعت کرتا ہوں اور آپ سے خدا کے رستہ میں جہاد کرنے کی بیعت کرتا ہوں۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں میرا خدا مجھ سے خوش ہوجائے۔ آپ نے فرمایا کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اُس نے کہا دونوں زندہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ خدا تم سے راضی ہوجائے۔ اس نے کہا ہاں یَا رَسُوْلَ اللہ! آپ نے فرمایا پھر بہتر یہ ہے کہ واپس جاؤ اور اپنے والدین کی خدمت کرو اور خوب خدمت کرو۔

(بخاری کتاب الادب باب لا یجاهد الا باذن الابوین)

آپ ہمیشہ اس بات کی نصیحت کیا کرتے تھے کہ حسن سلوک میں مذہب کی کوئی شرط نہیں۔ غریب رشتہ دار خواہ کسی مذہب کے ہوں اُن سے حسن سلوک کرنا نیکی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی مشرکہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اسماءؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یَا رَسُوْلَ اللہ! کیا میں اُس سے حسن سلوک کرسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا ضرور وہ تیری ماں ہے تو اُس سے حسن سلوک کر۔ (بخاری کتاب الادب باب صلة الوالد المشرك)

رشتہ دار تو الگ رہے آپ اپنے رشتہ داروں کے رشتہ داروں اور اُن کے

دوستوں تک کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ جب کبھی آپ قربانی کرتے تو آپ حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کی طرف ضرور گوشت بھجواتے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدیجہؓ کی سہیلیوں کو نہ بھولنا اُن کی طرف گوشت ضرور بھجوانا۔

(مسلم کتاب فضائل الصحابۃ باب من فضائل خدیجہ)

ایک دفعہ حضرت خدیجہ کی وفات کے کئی سال بعد آپ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہؓ آپ سے ملنے آئیں اور دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا'' کیا میں اندر آسکتی ہوں''؟ ہالہؓ کی آواز میں اُس وقت اپنی مرحومہ بہن حضرت خدیجہؓ سے بے انتہاء مشابہت پیدا ہوگئی۔ اس آواز کے کان میں پڑتے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر کپکپی آگئی پھر آپ سنبھل گئے اور فرمایا آہ میرے خدا! یہ تو خدیجہ کی بہن ہالہؓ ہیں۔ (بخاری کتاب المناقب الانصار باب تزویج النبی ﷺ خدیجۃ الخ) درحقیقت سچی محبت کا اصول ہی یہی ہے کہ جس سے پیار ہو اور جس کا ادب ہو اُس کے قریبیوں اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں سے بھی محبت اور پیار پیدا ہوجاتا ہے۔

انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ سفر پر تھا جریرؓ بن عبداللہؓ ایک دوسرے صحابی بھی اس سفر میں ساتھ تھے وہ سفر میں نوکروں کی طرح میرے کام کیا کرتے تھے۔ جریرؓ بڑے تھے اور اُن کا ادب حضرت انسؓ اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میں اُنہیں منع کرتا تھا کہ ایسا نہ کریں۔ میرے ایسا کہنے پر جریرؓ جواب میں کہتے تھے میں نے انصار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہاء خدمت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اُن کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ محبت دیکھ کر اپنے دل سے عہد کیا تھا کہ جب کبھی مجھے کسی انصاری کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملے گا یا اس کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا تو میں اُس کی خدمت کروں گا اس لئے آپ مجھے نہ روکیں میں اپنی قسم پوری کر رہا ہوں۔ (مسلم کتاب فضائل الصحابۃ باب فی حُسن صحبۃ الانصار الخ)

اس واقعہ سے بالوضاحت یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اپنے محبوب کی خدمت کرنے والا بھی انسان کا محبوب ہوجاتا ہے پس جن لوگوں کے دلوں میں اپنے ماں باپ کا سچا ادب اور احترام ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ کے علاوہ اُن کے رشتہ داروں اور دوستوں کا بھی ادب کرتے ہیں۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اقارب کی خدمت کا ذکر تھا تو آپ نے فرمایا بہترین نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے باپ کی دوستیوں کا بھی خیال رکھے۔ یہ بات آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہی تھی اور اس پر اُنہوں نے ایسا عمل کیا کہ ایک دفعہ وہ حج کے لئے جارہے تھے کہ رستہ میں ایک شخص اُن کو نظر آیا۔ آپ نے اپنی سواری کا گدھا اُس کو دے دیا اور اپنے سر کا خوبصورت عمامہ بھی اُس کو عطا کر دیا۔ اُن کے ساتھیوں نے اُنہیں کہا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے؟ یہ تو اعرابی لوگ ہیں بہت تھوڑی سی چیز اِن کو دے دی جائے تو خوش ہوجاتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا۔ اِس شخص کا باپ حضرت عمرؓ کا دوست تھا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے نیکی کا اعلیٰ درجے کا مظاہرہ یہ ہے کہ انسان اپنے باپ کے دوستوں کا بھی خیال رکھے۔

(مسلم کتاب البر والصلۃ والادب باب فضل صلۃ اصدقاء الاب الخ)

نیک صحبت

آپ ہمیشہ اپنے اردگرد نیک لوگوں کے رہنے کو پسند کرتے تھے اور اگر کسی میں کمزوری ہوتی تھی تو اُسے عمدگی کے ساتھ اور پردہ پوشی کے ساتھ نصیحت فرماتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے، نیک دوست اور نیک مجلسی اور بد دوست اور بد مجلسی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص مشک لئے پھر رہا ہو، مشک اُٹھانے والا اُس کو کھائے گا تب بھی فائدہ اُٹھائے گا اور رکھ چھوڑے گا تب بھی خوشبو حاصل کرے گا۔ اور جس کے ہم مجلس بد ہوں اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بھٹی کی آگ میں پھونکیں مارتا ہے۔ وہ اتنی ہی اُمید رکھ سکتا ہے کہ کوئی چنگاری اُڑ کر اُس کے کپڑوں کو جلادے یا کوئلوں کی بدبو سے اُس کا دماغ خراب ہوجائے۔

(مسلم کتاب البر والصلۃ باب استحباب مجالسۃ الصالحین الخ)

آپ اپنے صحابہؓ کو بار بار فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے اخلاق ویسے ہی ہو جاتے ہیں جیسی مجلس میں وہ بیٹھتا ہے اس لئے نیک صحبت اختیار کیا کرو۔

لوگوں کے ایمان کی حفاظت کا خیال

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ کسی شخص کو ٹھوکر نہ لگے۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے کہ آپ کی ایک بیوی صفیہؓ بنت حیی آپ سے ملنے آئیں۔ باتیں کرتے کرتے دیر ہوگئی تو آپ نے مناسب سمجھا کہ اُن کو گھر تک پہنچا آئیں۔ جب آپ اُن کو گھر چھوڑنے کے لئے جارہے تھے تو راستہ میں دو شخص ملے، جن کے متعلق آپ کو شبہ تھا کہ شاید اُن کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی عورت کے ساتھ رات کے وقت کہاں جارہے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ٹھہرالیا اور فرمایا۔ دیکھو! یہ میری بیوی صفیہؓ ہیں۔ اُنہوں نے کہا یَارَسُوْلَ اللّٰہ! ہمیں آپ پر بدظنی کا خیال پیدا ہی کس طرح ہوسکتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ شیطان انسان کے خون میں پھرتا ہے میں ڈرا کہ تمہارے ایمان کو ضعف نہ پہنچ جائے۔ (بخاری کتاب الاعتکاف باب ھل یخرج المعتکف لحوائجہ الخ)

❁❁❁